مصنف اور ماہنامہ سب رس کے اڈیٹر بھی ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے زبان وبیان کی صحت کا خیال نہیں رکھا، مثلاً اس کی توضیح وتشریح اس تعلیمات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے (ص ۲۴) اور چونکہ حضرت جانم کی عمر اس وقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو آپ کی پیدائش کا سنہ ۸۸۴ھ تا ۸۸۶ھ ہو گا" (ص ۳۱) جب سے ۹۰۰ھ مستخرج ہوتے ہیں (ص ۳۷) وہاں زیارت کی کسی مرد آدمی کو اجازت نہیں ہے (ص ۳۸) حضرت برہان الدین نے ...... حضرت امین الدین اعلیٰ کی تعلیم وتربیت اور اتالیقی انھیں کے تفویض کی تھی (۴۷) ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم نے الہ آباد یونیورسٹی کے رسالے میں شائع کر رہا ہے (ص ۵۵) اپنے والد کے وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے (ص ۶۲) میں ایسی زمین خریدنا چاہتا ہوں جو اکل حلال سے خریدی ہوئی ہے (ص ۸۲) جو چیزیں آپنے رکھ چھوڑی ہیں اس میں کیا اسرار ہے (ص ۸۳) اس کا اردو کلیات ابھی تک بھی دستیاب نہ ہو سکا (ص ۱۰۰) حضرت نے بھنگ کی بجائے پانی یا شربت کا پیالہ عنایت کیا (ص ۱۱۳) خالص فارسی الفاظ کی بجائے (ص ۱۱۳) جو مخطوطے کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں وہ تحریف وتصرف کے اندیشے سے خالی نہیں ہیں (ص ۱۳۱) مزید تین مراثی الامی اعلی اور غلامی کے مرثے بھی پیش ہیں (ص ۲۰۰) امیدی کا یہ قصہ اچھی اور طبع زاد ہے (ص ۲۱۳) بحری کی چار غزلوں کی تضمین کی ہے (ص ۲۲۷) یہ غزل یہاں کے کتبخانوں میں بیاضوں میں بھی موجود ہے (ص ۱۳۲) اپنے مریدوں کو تعلیم وتدریس کیلئے فارسی کی بجائے اس زبان کو اپنایا (ص ۲۳۵) جس کے تین مثنویاں ملتی ہیں (ص ۲۴۴) وجدی کے مثنویاں (ص ۵۱) اپنے دربار میں متعین کر لیا (ص ۲۵۲) شفیق کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا وہ اورنگزیب عالمگیر کے ہمراہ دکن آئے (ص ۲۷۰) مشائخ وعمائد جمع ہیں مگر مصنف نے مشائخوں، مشائخین اور عمائدین لکھا ہے، اور مشائخ کو واحد استعمال کیا ہے، جیسے یہاں کے ایک مشائخ" (ص ۱۵۹) لکھتے ہیں "یہ مثنوی چھپ چکی ہے، ڈاکٹر زور مرحوم نے اسکو مرتب کیا تھا ابھی منظر عام پر نہ آسکی" (ص ۲۰۲) چھپنے کے باوجود منظر عام پر نہ آنے کا کیا مطلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سال کے ۳۶۰ دن کے مطابق" (ص ۲۱۵) قمری سال ۳۵۵ اور شمسی سال ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے۔ انکے علاوہ بھی غلطیاں ہیں، ممکن ہے کچھ کتابت وطباعت کی بھی ہوں۔ قیمت بھی زیادہ ہے۔ "ر، ص"

جلد ۱۲۰ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۷ء عدد ۳

مضامین

.....٥٥٥.....

شذرات

گذشتہ دسمبر اور جنوری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دو بہت اچھے سمینار ہوئے، دونوں کے یہاں کے مباحث کی نوعیت یکساں تھی، جامعہ اسلامیہ میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" پر بحث تھی، مسلم یونیورسٹی میں موضوع "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" تھا، ان دونوں مذاکرات کا خوش آیند پہلو یہ تھا کہ ان میں قدیم خیالات کے علما اور جدید رنگ کے ارباب علم کی خاطر خواہ نمایندگی تھی،

ایسی مجلسوں میں علما پر ذمہ داری زیادہ عائد ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنے نبی کے وارث، اسلام کے محافظ اور پشتیبان سمجھے جاتے ہیں، ان میں انکی شرکت محض نمایندگی کی خاطر نہیں بلکہ جہاد لسان اور جہاد تحریر کے جذبے میں ہونی چاہئے، آجکل جدید طبقہ مذہبی معاملات میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے اس کو وہ محض بے راہ روی اور گمرہی کہکر ٹال نہیں سکتے، انکی باتیں اب محض اسلیے نہیں قبول کیجا سکتی ہیں کہ وہ کسی مذہبی مدرسہ کے سند یافتہ عالم یا فقیہ یا محدث ہیں، جدید طبقہ اپنے شکوک و اوہام کا مریض ضرور ہے، مگر وہ اپنی عقل کو اپنی گرفت میں رکھکر عقلیاتی اور منطقیانہ انداز میں ہر چیز کو سمجھنا اور پرکھنا چاہتا ہے، علما کو ان ہی کے انداز میں ان کی ذہنی الجھنوں کے زہر کا تریاق پیش کرنا ہے،

علما، محراب و منبر کی زینت ضرور بنے رہیں مگر گرتے ہوئے کو سنبھالنے، بگڑے ہوئے کو سنوارنے اور بھٹکتے ہوئے کو راہ راست پر لانے کی دعوت کو بھی لیکر آگے بڑھیں، انکی دعوت میں عزیمت ہو، اور عزیمت میں دلجوئی اور دلنوازی ہو، واعظانہ تنبیہ و تہدید کے بجائے رد ادانہ افہام و تفہیم کے ساتھ مصلحانہ انداز تخاطب ہو،

ع : کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے

ہمارے علما پر یہ اعتراض برابر ہوتا رہا کہ کسی مسئلہ پر ان کا متحد ہونا آسان نہیں، خود حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان پر یہی اعتراض کیا ہے، جہانگیر جب تخت پر بیٹھا تو اکبر کے دین الٰہی کے فتنہ کے سد باب

کے لئے اس سے حکومت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کو کہا گیا، اس نے حکم دیا کہ چار دیندار عالم منتخب کیے جائیں تاکہ انکے مشورے سے ملکی نظم و نسق قائم کیا جائے، اسکی اطلاع حضرت مجدد الف ثانی کو دیگئی تو انھوں نے فرمایا کہ چار کے بجائے ایک ہی عالم کا انتخاب کیا جائے تو بہتر ہے ورنہ ان میں اپنی بڑائی جتانے کی کوشش میں اختلاف پیدا ہوگا، موجودہ دور کے علما کو اپنے مقصد میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کرکے اس دیرینہ اعتراض کو بھی دور کرنا ہے،

ایسے سمینار میں ایسے ارباب علم بھی جمع ہوتے ہیں جو ملک یا بیرونی ملک کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور موجودہ اصطلاح میں دانشور کہلاتے ہیں، ان میں بعض مقالہ نگار اور مقرر اپنے خیالات مسائل حاضرہ کو سامنے رکھکر نظر کی دور بینی فکر کی گہرائی اور بصیرت کی مآل اندیشی کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ان کی تحریروں اور باتوں میں مذہبی درد و اخلاص بھی ہوتا ہے، انکو قدیم خیال کے علما محض اسلیے نظر انداز کردیں کہ وہ سند یافتہ عالم نہیں ہیں تو یہ مناسب نہیں، مگر ان ہی میں کچھ ایسے دانشور بھی ہوتے ہیں، جن کے خیالات سنکر یہ شک ہونے لگتا ہے کہ ان میں واقعی اسلام کا درد ہے یا محض اپنی برق طبعی اور شعلہ مقالی کا ثبوت دے رہے ہیں، یا کسی سیاسی مصالح یا کسی ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر یا مستشرقین کی تلبیسات سے مرعوب ہوکر اظہار خیال کر رہے ہیں، یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے جب اسی مجلس میں کسی نہ کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اسلامی شعار اور طرز فکر کے پابند نہیں،

ایسے اجتماع میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب نماز کے لیے وقفہ کیا جاتا ہے تو کچھ دانشور نماز پڑھنے کے بجائے سگار اور سگریٹ کے دھوؤں میں اپنی اسلامی فکر کے ذہنی عقاب کو اڑتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں، اگر کوئی ان سے یہ سوال کر بیٹھے کہ تارک صوم و صلوٰۃ کو ایسے سمینار میں شریک ہونے کا حق نہیں تو کیا یہ ضمیر کی آزادی اور نجی معاملات میں مداخلت پر محمول کیا جائے گا؟

ڈاکٹر اقبال تقریباً ساٹھ سال پہلے توحید ری اور دولت عثمانی کو یاد کر کے اپنے زمانے کے ذوق کی تن آسانی، انداز مسلمانی اور اسلاف کی نسبت روحانی سے محرومی پر بہت ہی مضطرب ہوکر خداوند تعالیٰ کی طرف سے کہہ اٹھے تھے، ؎

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلمان ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

اس کا مخاطب کون ہے؟ مسلمانوں کے عوام یا ان کے خواص یا ان کے علماء یا ان کے دانشور؟

مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عزت حاملِ قرآن ہی ہوکر حاصل کرسکتے ہیں، جو گو مشکل نہیں لیکن ایسا سمجھا جاتا ہے، اگر یہ آسان نہیں تو کم از کم ان مسائل کا حل تو نکالا جاسکتا ہے، جو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات میں متنازعہ فیہ بن گئے ہیں، یہ حل اچھے علماء اور اچھے دانشوروں ہی کے اجماع سے نکل سکتا ہے، مگر ہندوستان میں اجماع کی مثال بہت ہی کم ملتی ہے، علماء اپنے اپنے طور پر فتاوی دیتے رہے ہیں، ان میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے، جس سے عام مسلمان بعض مسائل کو متفقہ طور پر جائز یا ناجائز سمجھنے سے بالکل ہی قاصر رہتے ہیں اور وہ اپنے کو زمانہ کے ساتھ بہنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، پھر ان کو یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ وہ اسلام کو نہیں چھوڑ رہے ہیں بلکہ اسلام انکو چھوڑ رہا ہے، مسلمانوں کو اسی ذہنی انتشار سے محفوظ رکھنا ضروری ہے،

وہ زبان حال سے سوال کررہے ہیں کہ کیا اسلام کے نزدیک مسائلِ فقہ میں کسی اصلاح اور تغیر کی ضرورت نہیں؟ کیا اجتہاد کا دروازہ بالکل ہی بند ہوچکا ہے؟ اگر کسی مجتہد نے اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق اجتہاد کیا تھا تو بدلے ہوئے حالات میں اس مجتہد سے اختلاف کرنا صحیح نہیں؟ رواج زمانہ کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، اگر کوئی نیا رواج پیدا ہوجائے تو زمانہ کے علماء کا اس کے موافق فتوی دینا جائز ہے یا نہیں؟ گذشتہ دور کے مجتہد اگر موجودہ زمانہ میں ہوتے تو کیا وہی سب کچھ کہتے جو اپنے زمانہ میں کہہ چکے تھے؟ ظاہر مذہب پر حکم دیتے یا رواج کو چھوڑ دیتے؟ اگر احکام زمانہ کے اختلاف سے بدل سکتے ہیں، تو اس کی کیا حد ہو؟

نئے مسائل پہلے بھی پیدا ہوتے رہے، ان کا حل بھی نکالا جاتا رہا، مولانا شبلیؒ نے علامہ شامی کے رسالہ نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف کے حوالے سے لکھا ہے کہ عام رواج کی بنا پر کلیات کا حکم خاص کردیا جاتا ہے، سوال یہ نہیں کہ علامہ شامیؒ اور مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں کیا کہا سوال یہ ہے کہ اب کیا ہونا چاہئے؟ اس کے لیے اچھے علماء اور اچھے دانشوروں کے اجماع کی سخت ضرورت ہے، جو اگر نہیں کیا گیا تو یہ ایک بڑی ملی کوتاہی اور غفلت پر محمول کیا جائے گا،

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، ان پر دو آدمیوں کے قتل کا خونبہا واجب الادا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مطالبہ کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے تو ایک یہودی نے ایک کوٹھے پر سے پتھر لڑھکا کر آپ کو شہید کرنے کی کوشش کی، مگر آپ کو اس کی خبر ہوئی تو بچ کر لوٹ آئے، چند دنوں کے بعد یہودیوں میں سے بنی قریظہ نے گذشتہ معاہدہ کی تجدید کرلی، بنو نضیر سے بھی اس کی تجدید کرنے کو کہا گیا تو وہ راضی نہیں ہوئے بلکہ اس کے بجائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر تشریف لائیں، وہ بھی تین عالم ساتھ لائیں گے، اگر ان کے عالم آپ پر ایمان لے آئے تو وہ بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے، آپ نے منظور فرما لیا، لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ انھوں نے اس بہانہ سے شہید کرنے کیلئے بلایا ہے، ان کی اس سرکشی سے مجبور ہوکر آپ نے ان کا محاصرہ کیا، پندرہ دن کے بعد انھوں نے صلح کرلی، اور اپنے مال و متاع کے ساتھ خیبر منتقل ہوجانے کے طلبگار ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دیدی، اور پھر جس طرح

وہ مدینہ سے رخصت کئے گئے ہیں اس کی تصویر مولانا شبلی نے اس طرح کھینچی ہے:

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروۃ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سر و سامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی" ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں، ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لیے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو جانے دیں گے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری (لا اکراہ فی الدین (بقرہ ۲۵۶)) یعنی مذہب میں زبردستی نہیں۔

(ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام۔ سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۷۹)

دشمنوں سے یہ رواداری کی مثال کسی اور قوم کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی، یہودیوں کی کتاب توریت میں لڑنے والے دشمنوں کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ سب کے سب قتل کر دیے جائیں، ان کی عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے جائیں اور ان کا سارا سامان مال غنیمت سمجھا جائے،

یہودیوں کی شر انگیزی جاری رہی، بنی قریظہ سے معاہدہ کی تجدید ہو گئی تھی مگر وہ بھی نچنت نہیں بیٹھے، بنی نضیر نے ان کو توڑ لیا، جس کے بعد بنی نضیر، بنی قریظہ، قریش اور دوسرے قبیلوں نے مل کر چوبیس ہزار کی فوج تیار کی اور مدینہ پر چڑھائی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد خندق کھود کر ان کا مقابلہ کیا، اسی لیے یہ جنگ احزاب یا غزوہ خندق کے نام سے موسوم ہوئی، ایک مہینہ تک یہ محاصرہ جاری رہا، کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا تو مسلمانوں

پر کئی فاقے گذر گئے، ایک دن صحابہ نے بے تاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہوئے ہیں، آپ نے اپنا شکم مبارک کھول کر دکھایا تو اس پر ایک کے بجائے دو پتھر بندھے ہوئے تھے، اسی حالت میں صحابہ کرام دشمنوں کا مقابلہ بڑی بہادری اور جرأت سے کرتے رہے، یہاں تک کہ دشمنوں نے خود سامان رسد کی کمی، موسم کی ناخوشگواری اور یہودیوں کی بے وفائی سے عاجز ہو کر میدان چھوڑ دیا، بنی قریظہ جنگ سے واپس ہونے لگے تو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو اپنے یہاں لیتے گئے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بڑھے تو وہ عہد شکنی پر نادم کیا ہوتے الٹے آپ کو گالیاں دینی شروع کیں، جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا اور جب انھوں نے سپر ڈال دی تو ان کی سرکشی اور بد عہدی کی سزا ان کو توریت کے حکم کے مطابق دی گئی۔ توراۃ کتاب تثنیہ ۱۰ صحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے :-

”جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر، اور جب تیرا خدا تجھکو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی۔“

یہودیوں کی اسلام دشمنی کا مرکز خیبر میں منتقل ہو گیا، جو مدینہ منورہ سے دو سو میل پر واقع ہے، یہاں ان کے چھ بڑے بڑے قلعے سالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق اور مربطہ تھے، ان پر یہودیوں کو بڑا غرور تھا، اسی لیے خیبر کو بڑا مرکز بنا کر اسلام کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا، بنی نضیر یہاں جلاوطن ہو کر آئے تو یہاں کے یہودیوں سے مل کر تمام عرب میں اسلام کے خلاف بغاوت

برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مکہ جاکر قریش کو ابھارا، جنگ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف مدد پہنچائی، احزاب میں اسلام کے دشمنوں کو شکست ہوئی، تو مدینہ پر حملہ کرنے کی سازش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کے لیے آپ کی چراگاہ سے اونٹنیاں چرا کر لیگئے ان کو روکنے میں ایک جھڑپ ہوئی تو حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کا قتل ہوگیا انکی بیوی یہودیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عفو اور درگذر سے کام لیتے رہے، لیکن ان کی سازشیں خطرناک ہوتی چلی گئیں تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، خیبر کی جنگ میں حضرت علیؓ نے جو بہادری، جرأت اور پامردی دکھائی وہ اسلام کی تاریخ کا ایک بڑا روشن باب ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لڑائی کا علم دینے لگے تو انھوں نے عرض کیا کہ کیا یہود کو لڑکر مسلمان بنالیں، ارشاد ہوا، نرمی سے ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری، سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۴۷)

حضرت علیؓ کی جانبازی سے خیبر فتح ہوا تو مسلمانوں نے وہاں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا، یہودیوں نے درخواست کی کہ زمینیں ان کے قبضہ میں رہنے دی جائیں، وہ پیداوار کا نصف حصہ ادا کیا کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی التجا کو منظور کیا، بٹائی کا وقت آیا تو غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا اور یہودیوں سے کہا گیا کہ ان میں سے جو حصہ چاہیں وہ لے لیں، یہود اس عدل پر متاثر ہوکر بول اٹھے کہ زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷، طبری ج ۳ ص ۸۹ - سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۸۹ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد اول ص ۶۵)

اس جنگ میں رئیس خیبر کی لڑکی صفیہ گرفتار ہوئیں تو ایک صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کے

حصہ میں پڑیں، لیکن لوگوں نے اعتراض کیا کہ قریظہ اور نضیر کی رئیسہ کسی اور کے حصہ میں نہیں جاسکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی اس کا اہل نہیں، اس اعتراض پر آپ نے صفیہ کو پہلے آزاد کیا، پھر اپنے عقد میں لے لیا، آپ نے اس خاتون کے رتبہ کے لحاظ سے اپنی کنیز بنانا پسند نہیں فرمایا، (مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ آزاد ہوکر اپنے یہاں چلی جائیں یا نکاح میں آنا قبول کریں، انھوں نے دوسری صورت پسند کی اور آپ کے نکاح میں آگئیں، اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی نے تحریر فرمایا ہے

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں، وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلہ نضیر کا رئیس تھا، باپ اور شوہر دونوں قتل کیے جا چکے تھے، اس حالت میں ان کے پاس خاطر، حفظ مراتب اور رفع غم کیلئے اسکے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلعم انکو اپنے عقد میں لے لیں وہ کنیز ہوکر بھی رہ سکتی تھیں لیکن آنحضرت صلعم نے انکی خاندانی عزت کے لحاظ سے ان کو آزاد کردیا اور پھر نکاح پڑھایا، حسن خلق رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرز عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۹۲)

جان، عزت، آبرو اور مذہب کے دشمنوں کے یہاں رشتہ قائم کرنا خطرے سے خالی نہ تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے قلوب کی تسخیر کی خاطر یہ رواداری اور فراخدلی دکھائی، رسول اللہؐ کو حضرت صفیہؓ سے بڑی محبت رہی، نکاح کے بعد ان کو اپنے اونٹ پر سوار کیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، برابر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپ سفر میں تھے کہ حضرت صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا، آپ کی ازواج مطہرات میں سے حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت

سے زیادہ اونٹ تھے، آپ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہ کو دیدو، حضرت زینبؓ بول اٹھیں
کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ناراض ہوئے
کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے، ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہؓ کے
پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، ان کے رونے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ
عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ وہ آپ کی چچازاد بہن بھی ہیں اس لیے وہ تمام ازواج میں افضل
ہیں، رسول اللہ نے فرمایا تم نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور
محمد میرے شوہر ہیں، اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہوسکتی ہو (سیرۃ النبی جلد ۲ ص ۴۰۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کے یہودیوں کے جان ومال، امن وامان کے ضامن ہوئے
مگر وہ اپنی شرانگیزیوں سے باز نہیں آئے، ایک دن ایک یہودی عورت زینب نے چند صحابہ
کے ساتھ آپ کی دعوت کی، وہ یہودیوں کے سردار مرحب کی بھاوج تھی، جو حضرت علیؓ کے
ہاتھوں خیبر کی لڑائی میں ہلاک ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم میں زینب کی دعوت
قبول فرمائی، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپ نے کھانا بہت کم نوش فرمایا، مگر ایک صحابی
بشر بن براؤ یہ کھانا کھاکر زہر کے اثر سے وفات پا گئے، رسول اللہ صلعم نے زینب کو بلا کر پوچھا
تو اس نے اپنے جرم کا اقبال کیا، یہودیوں نے بھی اقرار کیا کہ ہم نے اس لیے زہر دیا کہ اگر
آپ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا، اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ سے نجات مل جائے گی
رسول اللہ صلعم نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا، لیکن بشرؓ بن براؤ کی وفات پر
زینب قصاص میں قتل کر دی گئی، (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۹۳)

ایک دفعہ دو صحابی خیبر گئے، یہودیوں نے ان میں سے ایک صحابی عبد اللہؓ کو قتل کرکے
نہر میں ڈالدیا، دوسرے صحابی محیصہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی تو

آپ نے ان سے پوچھا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے عبد اللہ کو قتل کیا، محیصہ نے عرض کیا
کہ یہودی تو پچاس مسلمانوں کو قتل کرکے جھوٹی قسمیں کھالیں گے، رسول اللہؐ اس جواب
سے مطمئن نہیں ہوئے، اس لیے یہودیوں سے تعرض نہیں کیا، اور بیت المال سے مقتول
کا خونبہا دلایا (سیرۃ النبی جلد اول ص ۹۳-۴۹۲)

قرآن مجید میں یہودیوں کی بدطینتی اور بدکرداری کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عملی زندگی میں اس کا عملی ثبوت ملتا رہا، مگر آپ کا دل یہودیوں کے برے
برتاؤ کے باوجود سخت ہونے کے بجائے نرم رہا، آپ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ
بھی دیا، حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار کی مالیت کا صدقہ
دیا، تو آپ نے اس میں کوئی مزاحمت نہیں فرمائی، (سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۲۴۱)

آپ نے ہمسایہ کا حق ادا کرنے کی جو تلقین کی اس میں یہودی اور غیر مسلم کی کوئی تفریق
نہیں رکھی، اور آپ کی اس تعلیم پر صحابہ کرام برابر عمل کرتے رہے حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے
ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر
کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ میں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبرئیل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے
تھے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے، (ابوداؤد کتاب الادب
باب فی حق الجوار، سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۲۸۶)

ایک دفعہ ایک یہودی نے برسر بازار کہا قسم اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام
انبیاء پر فضیلت دی، ایک صحابی نے یہ سنکر پوچھا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی" اس نے کہا
"ان پر بھی" صحابی نے غصہ میں اس کو ایک تھپڑ مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

عدل و انصاف کی شہرت تھی، وہ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور صحابی کی شکایت کی، آپ نے صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی (صحیح بخاری، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۰)

ایک دفعہ چند یہودی آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تجھ پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ موجود تھیں، انھوں نے جواب میں کہا، وعلیکم السام واللعنۃ یعنی تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو، آپ نے ان کو روک کر فرمایا عائشہ! بد زبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے، (صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ ص ۲۳۹ سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۱) تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۱۸۸)

ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، تو ایک یہودی کا جنازہ گذرا، اس کو دیکھ کر آپ کھڑے ہوگئے (صحیح بخاری کتاب الجنائز، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۱)

آپ یہودیوں سے لین دین کرنے میں تامل بھی نہ فرماتے، گو وہ آپ سے سختی اور گستاخی سے پیش آتے رہے، زید بن سعنہ جب یہودی تھے، تو ایک بار آپ نے ان سے قرض لیا، ابھی قرض کی واپسی کی میعاد بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تقاضے کے لئے آگئے، آپ کی چادر پکڑ کر سخت سست کہا، حضرت عمرؓ موجود تھے، انھوں نے کہا او دشمن خدا، رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا، عمر! تم سے کچھ اور امید تھی، اس کو سمجھانا چاہئے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں قرض ادا کردوں، اس کے بعد یہودی کا قرض ادا کرکے بیس صاع کھجور اور زیادہ دلے (سیرۃ النبی جلد ۲ ص ۳۵۸ بحوالہ بیہقی، ابن حبان، طبرانی)

ایک دفعہ ایک یہودی سے ایک جوڑا کپڑا قرض منگوا بھیجا، اس گستاخ نے کہلا بھیجا کہ وہ میرا مال یونہی اڑا لینا چاہتے ہیں، یہ سنکر رسول اللہ نے صرف اتنا فرمایا، وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں (جامع ترمذی کتاب البیوع، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۵۸)

رسول اکرمؐ نے اپنے ابتدائی دور میں صحابۂ کرام کو یہود و نصاریٰ سے روایت کرنے اور ان کی کتابوں کے دیکھنے کی ممانعت فرمائی تھی، مگر بعد میں جب التباس و اختلاط کا خوف جاتا رہا تو ان سے روایت کرنے کی اجازت دیدی، اور خود ان کی کتابوں کے واقعات بیان فرماتے (بخاری باب ما ذکر عن بنی اسرائیل مع فتح الباری و تاریخ اخلاق اسلامی از مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۳۵ - ۲۳۲)

آپ نے اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی، اس میں کافر، مسلمان، عابد، فاسق، دوست، دشمن، مسافر اور شہری کی کوئی قید نہیں تھی، آپ نے صحابۂ کرام کی ایک مجلس میں فرمایا خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، وہ ایمان نہیں لایا، صحابۂ کرام نے پوچھا کون ایمان نہیں لایا، آپ نے فرمایا جو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ہے، ایک اور موقع پر فرمایا، وہ شخص مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو، (بخاری کتاب الادب باب الوصیۃ بالجار، ادب المفرد باب لا یشبع دون جارہ، تاریخ اخلاق اسلامی صفحہ ۱۷۰-۱۷۱)

رسول اللہ صلعم اور عیسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی لڑائی عیسائیوں سے نہیں ہوئی، ان سے معاہدے ہوتے رہے، ۹ھ میں آپ نے سینا، پہاڑی کے عیسائی راہبوں کو جو سینٹ کیتھرائین کی خانقاہ میں رہتے تھے، بڑی مراعات دیں، یہ رواداری کی ایک شاندار مثال ہے، اس چارٹر میں آپ نے اپنے پیرووں کی طرف سے یہ ضمانت لی کہ عیسائیوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائیگا ان کے گرجے اور ان کے پادریوں کی رہائش گاہوں کی پوری حفاظت کی جائے گی، ان پر غیر منصفانہ طور پر ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، کوئی بشپ اپنے منصب سے معزول نہ کیا جائے گا، کسی عیسائی کو جبر سے اس کے مذہب سے منحرف نہ کیا جائے گا، کوئی راہب اپنی خانقاہ سے نہ نکالا جائے گا، کوئی عیسائی اپنے مقدس مقامات کی زیارت کو جائیگا تو اس

زیارت میں اس کی کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی، کسی گرجے کو منہدم کر کے مسجد یا کسی مسلمان کا گھر نہ بنایا جائے گا، جو عیسائی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں ہیں ان کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی پوری اجازت ہوگی، ان پر مذہب کی تبدیلی کیلئے کوئی جبر اور زور نہ ڈالا جائے گا، اگر عیسائیوں کو اپنے گرجوں، خانقاہوں اور مذہبی عمارتوں کی مرمت کے لیے امداد کی ضرورت ہوگی تو مسلمان ان کو مالی امداد دیں گے، ان شرائط کی خلاف ورزی مسلمان کریں گے تو ان کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ (اے شارٹ ہسٹری آف دی سارسنس از امیر علی ص ۱۴-۱۵)

عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلعم نے ہمیشہ اچھا سلوک کیا، حاتم طائی کے بیٹے عدی اپنے قبیلہ کے سردار اور مذہباً عیسائی تھے جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے، ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے، عدی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر لیا،

(ابن ہشام، اسلام عدی بن حاتم، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۴۲-۱۴)

نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ رہا وہ بھی رواداری کی ایک بڑی اچھی مثال ہے، نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا اور ان کو اپنے طریقے پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدی (زاد المعاد، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۱)

سنہ ۱۰ھ جب پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیر نگیں ہو گیا تو نجران کے عیسائیوں کو جو حقوق دیئے گئے وہ یہ تھے: نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا مذہب،

ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفراء، ان کی عورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی اور نہ ان کی مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، اور جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے اسی طرح رہے گا۔ ان کے زمانہ میں جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا۔ ان سے نہ فوجی خدمت لیجائے گی اور نہ ان پر عشر لگایا جائے گا، اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی۔ ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ (فتوح البلدان، بلاذری ص ۷۱، مطبوعہ مصر، کتاب الخراج امام ابو یوسف و دین رحمت مطبوعہ دار المصنفین ص ۳۸-۲۳۷)

رواداری کا مفہوم

رواداری قابل تعریف صفت ہے، مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی حال میں بھی رواداری سے انحراف نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ رحمان ہے، رحیم ہے، ستار ہے، غفار ہے، تواب ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ قہار بھی ہے، وہ اپنی ستاری اور غفاری میں کفر اور شرک کو بھی برداشت کیے ہوئے ہے، مگر جب اس کی قہاری بروئے کار آتی ہے تو بستیاں کی بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، پوری قوم صفحۂ دنیا سے ختم ہو جاتی ہے، حضرت نوحؑ، حضرت یونسؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یوشعؑ، حضرت شیثؑ کی قومیں ایسی نیست و نابود کر دی گئیں کہ ان پیغمبروں کا نام لینے والا بھی کوئی باقی نہیں رہا، جس سے یہ ظاہر ہے کہ رحم و کرم اور رواداری ہر موقع پر مفید اور موثر نہیں ہوتی، مختلف حالتوں میں مختلف صورتیں پیش آتی رہتی ہیں، اس لیے انسانیت کو سنوارنے کے لیے کبھی ایسا بھی رویہ اختیار

کرنا پڑتا ہے، جو ظاہر بیں نگاہوں میں سخت سمجھا جاتا ہے، ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مدبرانہ سختی کی بھی مثالیں ملیں گی، آپ نبی آخر الزماں تھے، آپ جامعیت کے پیکر بنا کر مبعوث ہوئے، اس لئے جہان گذشتہ تمام پیغمبروں کی صفتیں آپ کو ودیعت کی گئیں۔ . . . . حضرت عیسیٰ کا نرم اخلاق اور حضرت موسیٰ کی سختی بھی ملی (تفصیل کے لیے دیکھو خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی باب جامعیت)

حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی کہ تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال بھی پھیر دے، جو تجھ کو ایک میل بیگار لیجائے تو اس کے ساتھ دو میل جا، جو تیرا کوٹ مانگے تو تو اسکو اپنا کرتا بھی دیدے مگر انکے ماننے والوں نے اس تعلیم کو نظر انداز کر دیا، یورپ اور امریکہ میں حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، مگر کیا وہ اس تعلیم پر عمل کر رہے ہیں، ہیروشیما پر اٹیم بم گرا کر اس شہر کو تباہ کرنے والے وہی تھے، جو حضرت عیسیٰ کا دم بھرتے تھے، ان کے یہاں شہروں کو برباد کرنے والے انسانوں کے خون کی ندیاں بہانے والے اسلحہ کے طرح طرح کے کارخانے کیا اس لیے کھولے جا رہے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو فروغ دیں،

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں نرم اخلاق رہا وہاں آپ میں سختی بھی رہی، مگر اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپ اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرتے اور ان کا بھلا چاہتے لیکن خدا کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، اور حق کا راستہ روکنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے رہتے، میرے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی اپنے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ حضرت موسیٰ کے پاس ہم کو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے، مگر نرم اخلاق کا نہیں، حضرت عیسیٰ کے یہاں نرم اخلاق کی بہتات ہے، مگر سرگرم اور خون

میں حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں، اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی ضرورت ہے اور دونوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف ہمارے پیغمبر اسلام میں مل سکتی ہیں (خطبات مدراس ص۱۸۳)

اسلام کی لڑائیاں آپ کے یہاں دشمنوں سے معرکہ آرائی کی مثالیں بھی ملیں گی، مگر کون قوم اور کون ملک ہے جس کی تاریخ میں لڑائیوں کی مثالیں نہیں ملتی ہیں، آج کی متمدن دنیا تو اسکی قائل ہے کہ انسانی فروغ کے لیے جنگ لازمی ہے۔ بیسویں صدی کی متمدن دنیا میں دو ایسی لڑائیاں لڑی گئیں جو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نام سے یاد کیجاتی ہیں، ان لڑائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوا، انسانی خون کا سمندر بہایا گیا، انسان لنگڑے، لولے اور اندھے ہوئے، شہروں کی عمارتیں، عبادت گاہیں اور شفا خانے تباہ ہوئے، لاکھوں عورتیں بیوہ ہوئیں، اتنے ہی تعداد میں بچے یتیم ہوئے، دنیا میں اقتصادی بدحالی آئی، جنگ کے بعد جب صلحنامہ پر دستخط ہوئے تو ملکوں کے حصے بخرے کیے گئے، لاکھوں آدمی گھر سے بے گھر ہوئے، بعض ممالک کے گلوں میں سامراجیت کی غلامی کا طوق ڈالا گیا، ان کے باشندوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا گیا، ان کے ضمیر، زبان، مذہب کی آزادی پر پابندی عائد کی گئی، ان کے ملکوں کی دولت سے سامراجیت کے خزانے کو پر کیا گیا، اب ان ہی لڑائیوں کے فاتحوں کے کارناموں کو زریں قرار دے کر ان پر بے شمار جلدیں قلمبند کی جا چکی ہیں اور کیجا رہی ہیں۔

ہمارے رسول اکرمؐ نے بھی لڑائیاں لڑیں، مگر یہ لڑائیاں جنگ و جدل کی تاریخ کے لیے نمونہ بن سکتی ہیں، آپ کے غزوے سکندر اعظم کی طرح ذاتی شان و شوکت اور دبدبہ کے لیے نہ تھے، اور نہ شارلیمن کی طرح محض فتح و تسخیر کے لیے تھے، نہ نپولین کی طرح محض ملک گیری کی خاطر تھے، اور نہ ہٹلر کی طرح انتقام کے جذبے کو تسکین دینے کی خاطر تھے، نہ تاج و تخت کے لیے تھے، نہ اپنے ہمراہیوں اور علاقے کی معاشی خوشحالی کے لیے تھے، بلکہ آپ کو آپکے سارے

غزوات کی اجازت خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس لیے دی گئی کہ آپ پر ظلم کیا گیا اور آپ کے ساتھ آپ کے حامیوں کو ان کے گھروں سے اس لیے نکال دیا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے (سورہ حج ۶)

مکہ میں جن لوگوں نے فتنہ و فساد برپا کر رکھا تھا اور لوگوں کو امن و امان کی زندگی بسر کرنے نہیں دیتے تھے، ان کے خلاف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دینے کا حکم دیا گیا (انفال ۵)

پھر ان لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا جو نہ تو خود خدا اور جزا و سزا پر اعتقاد رکھتے اور نہ دوسروں کو ان پر یقین کامل رکھنے کی اجازت دیتے، مگر ایسے لوگوں کو طرح طرح سے ستاتے اور ان پر ظلم کرتے (توبہ ۴)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر فرانس جمہوریت، مساوات اور اخوت کے نام پر خونیں انقلاب لاکر اپنے سربرآوردہ رہنماؤں کو سولی پر چڑھا سکتا ہے، اس انقلاب کے بعد مراکش، الجزائر اور شام کو غلام بنائے رکھ سکتا ہے، انگلستان اپنے سامراجی جذبہ کو تسکین دینے کی خاطر امریکہ، کنیڈا، ہندوستان، مصر، عدن، روڈیشیا، جنوبی افریقہ کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال سکتا ہے، ہالینڈ محض زر اندوزی کی خاطر انڈونیشیا کو اپنی آہنی گرفت میں لا سکتا ہے، پرتگال اپنی آبادی کی مادی خوشحالی کے لیے ایشیا اور افریقہ کے علاقوں پر بیجا تسلط اور قبضہ جما کر اپنی توسیع پسندی پر ناز کر سکتا ہے، اور امریکہ جمہوریت کے نام پر ویٹ نام پر ستر لاکھ ٹن سے زیادہ ہلاکت آفریں اور زہریلے بم گرا سکتا ہے، روس اپنی بولشویزم کو کامیاب بنانے کے لیے انسانی خون سے ہولی کھیل سکتا ہے، اور مشرقی یورپ اور مشرقی جرمنی کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے اور برلن کے بیچ شہر میں یاجوجی

دیوار کھڑی کرکے اس شہر اور ملک کے اعزہ کو ملنے جلنے سے روک سکتا ہے، نیشنلزم کو فروغ دینے کے لیے دنیا کی دو بڑی لڑائیاں لڑکر ساری دنیا کو سیاسی اور معاشی بدحالی میں مبتلا کیا جا سکتا ہے، تو اگر ان لوگوں کے خلاف لڑائیاں لڑی گئیں جو ان پر ظلم کرتے تھے، اور یہ کہتے کہ ان کا رب خدا ہے، اور جس کام کو خدا نے حرام قرار دیا تھا، اس کو وہ حرام نہیں سمجھتے تو ایسی لڑائیاں کیوں ناجائز سمجھی جائیں،

ہم کچھ ایسے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہم اسلام اور اسلامی تعلیمات کو مدافعانہ اور معذرت خواہانہ رنگ میں پیش کرنے کے عادی ہو گئے آجکل کی جارحیت ہی میں اصلی مدافعت ہوتی ہے، اگر اسلام نے حق و صداقت کی ترویج کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کیا تو اس پر شرمانے کی ضرورت بھی نہیں،

انسانیت کو اسلام کا پیغام

اسلام کی یہ تعلیم رہی کہ انھیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھولے جائیں گے جنھیں ربانی حقائق کا یقین ہے اور اس یقین کے ساتھ ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، فلاح و نجات کا حصول کسی نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری ہے، خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے، عبادت کے لیے خدا اور بندے کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت کی حاجت نہیں، خدائے عز و جل کے سامنے اپنی بندگی اور

عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا ہی عبادت ہے، اسی کے ساتھ ہر وہ نیک کام جو خاص خدا اور
اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے
کیا جائے وہ بھی عبادت ہے، وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدے
کیلئے کرے وہ بھی عبادت ہے، اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم اور مرکزی رشتۂ اتحاد قائم کرنا بھی عبادت ہے،
تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر قلبی عبادات ہیں، تقویٰ یہ ہے کہ دل میں خیر و شر کی تمیز کیلئے خلش ہو،
اور اخلاص یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا خیال ہو، توکل یہ ہے کہ کسی کام میں خواہ کتنی رکاوٹیں
پیدا ہوں خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، صبر یہ ہے کہ اگر کامیابی
ہو تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، جس کا اقرار کرنا شکر ہے، اللہ کے
بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، اخلاق کی خوبی اس کے
علم و فلسفہ میں نہیں، بلکہ اس کے عمل میں ہے، اخلاق کی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی دنیاوی،
نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہو، غمخواری اور تیمارداری انسانیت کا ایک فرض ہے
لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا بھی انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب
کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ میں حائل نہ ہو،
انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم
ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اسکا
دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے، سخاوت اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے، اس سے ہم جنسوں کیساتھ
ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان
ہے، جس کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، یہ انسان کے چہرہ کا نور ہے، انسانوں میں سب سے
اچھا انسان رحم کرنے والا ہے، اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا پلہ کچھ کم بھاری نہیں

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں
میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں، اور جو قول و قرار
کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے
تو ٹل جائے مگر جو عہد کیا جائے اس کو ضرور پورا کیا جائے، کسی کی بھلائی کرنا ایک ایسی
صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے،
اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے، کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے،
بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان یہ ہے کہ وہ تواضع اور
خاکساری اختیار کریں، اخلاص کا بڑا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت
پر مقدم رکھا جائے، اسی کا نام ایثار ہے، باطل کو مٹانے اور ظلم و ستم کو روکنے میں شجاعت
اور بہادری دکھائی جائے، حق بات کے سلسلے میں چاہے جتنی مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں،
ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، حق گوئی کا اظہار سب سے زیادہ قابل ستائش ہے،
خیانت بدترین گناہوں میں سے ہے، غداری، دغابازی، بدعہدی بدترین قسم کی برائیاں
ہیں، ناپ تول میں کمی بیشی کرنا ملک میں فساد پھیلانے کے برابر ہے، خدا نے شراب اسکے پینے والے،
پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے،
اس کے لیجانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کے
یہاں ان کی بخشائش نہ ہوگی جو دل میں کینہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ظلم کو اپنے بندوں
کے لیے حرام کیا ہے، جو شخص اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کرتا ہے اسکا
ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا، یعنی اس کا اندھاپن قیامت کے ہولناک دن میں
اندھیرا بن کر نمودار ہوگا، تکبر مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے، مغرور

کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اعمال کی راستی و ناراستی، اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، اگر کوئی عمل صرف نمود و نمایش کے لیے ہے تو یہ ریا ہے، جس سے عمل کی ساری عمارت بودی اور کمزور ہو جاتی ہے. کفر کے بعد نفاق اور ریا کا درجہ ہے، فضول خرچی سے بداخلاقی پیدا ہوتی ہے، اور قومی سرمایہ بھی برباد ہوتا رہتا ہے. تمام بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، اور اس سے ہر حال میں پناہ مانگنے کی ضرورت ہے، فحش گوئی اور بدزبانی سے آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، رفق و ملاطفت شریفانہ اخلاق ہیں الخ الخ

انسانیت کو سنوارنے کے لیے لڑائیاں

اسلام کی یہی تعلیمات ہمارے ادارۂ دار المصنفین کی سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں میں پیش کی گئی ہیں، اوپر جو تعلیمات مختلف طریقہ پر پیش کی گئی ہیں، ان کی تفصیلات ان چھ جلدوں میں ملیں گی، اسلام میں اخلاق کے سارے فضائل کی تلقین اور سارے رذائل کی مذمت کی گئی ہے، کیا یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ہیں یا ان سے دوامی فیضان حاصل کر کے ساری انسانیت سنواری جا سکتی ہے، اگر ان سے انسانیت سنواری جا سکتی ہے تو ان تعلیمات سے انحراف یا انکار کرنے کا نام کفر ہے، اور اس کفر کو دبانے اور مٹانے میں جن لوگوں نے رکاوٹ پیدا کی تو ان کے خلاف ضرور جنگ کی گئی، جو کسی حال میں عدم رواداری کا ثبوت نہیں بلکہ ان لڑائیوں سے انسانیت کی گردن پر احسانات کا ایک بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اسلام کی نیام سے جو تلواریں نکلیں اس پر مسلمانوں کو شرمانے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس پر وہ فخر کر سکتے ہیں. دنیا کی کون ترقی یافتہ قوم ہے جس کی نیام سے تلوار نہیں نکلی.

لڑائیوں کے لیے اسلامی قانون جنگ و صلح

اسلام نے لڑائیوں کے لڑنے کے جو حسب ذیل ضوابط و قوانین مرتب کیے، اُن پر بھی انسانیت فخر کر سکتی ہے.

(۱) زیادتی کرنے والوں سے لڑائی لڑی جائے (الحجرات، آیت ۸)

(۲) جو لوگ دین کے بارے میں لڑیں ان سے بھی لڑائی کی جائے، جو لوگ گھروں سے نکال باہر کریں، ان سے اور ان کی مدد کرنے والوں سے بھی جنگ کی جائے (الممتحنہ رکوع ۲)

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر فوج روانہ فرماتے تو سردارِ فوج کو جو احکام دیتے ان میں ایک لازمی حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے، کسی بچے یا کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۰۸)

(۴) جب دشمنوں سے لڑائی ہو تو لشکر کی صفیں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح ہوں (سورۃ الصف رکوع ۱) اس سے یہ مراد ہے کہ صف آرائی میں پوری تنظیم ہو، تال میل میں کوئی کسر نہ ہو، عقیدے اور مقصد میں اتحاد ہو، سرفروشی اور جانبازی کا پورا جذبہ ہو،

(۵) جنگ کے موقع پر دشمنوں کے علاقے میں جو تخریبی کارروائی کی جائے، اس کو فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا (سورۃ الحشر آیت ۵)

(۶) جنگ کے زمانہ یا فتح کے بعد زمینوں، فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں (البقرہ - ۲۰۵)

(۷) دورانِ جنگ میں دشمن کے مال اور خاندان کو لوٹنے کی سخت ممانعت کی گئی،

آپ نے یہ منادی کرا رکھی تھی کہ جنگ کے موقع پر جو دوسروں کے گھروں میں جا کر وہاں
کے رہنے والے کو تنگ کرے یا لوٹے مارے تو اس کا جہاد قبول نہیں کیا جائے گا،
(ابو داؤد کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۵۲، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۱۲)

یہ بھی فرمایا کہ جو شخص محض لوٹ مار کر کے مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر جہاد کرتا
ہے، اس کو کوئی ثواب نہیں ملے گا، جہاد اس شخص کا ہے جو اس لیے کرتا ہے کہ
خدا کا (مراد کلمۃ اللہ) کا بول بالا ہو (بخاری کتاب الجہاد باب من
قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارۃ، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۱۵)

ایک دفعہ ایک لڑائی میں صحابی انتہائی تنگ حالی میں مبتلا ہو گئے، فاقہ کی نوبت
آگئی، بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا، تو سب اس پر ٹوٹ پڑے، بکریوں کو ذبح کر کے
گوشت پکانا شروع کیا تو آپ تشریف لائے، اور اپنی کمان سے گوشت کی ہانڈی
الٹ دی اور فرمایا لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے (ابو داؤد کتاب الجہاد
جلد ثانی باب فی النہی عن النہی اذا کان فی الطعام قلۃ و سیرۃ النبی ج اول ص ۶۱۰)

(۸) مقتولوں کا سر کاٹ کر گشت کرانے، یا دشمن کو گرفتار کر کے کسی چیز سے
باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بنانے یا تلوار سے قتل کرنے کی سخت ممانعت
کی گئی (المبسوط)

(۹) جب دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام ان سے لڑ کر ان کو کچل کر
رکھ دینا ہے، اس کے بعد قیدیوں پر مضبوطی کے ساتھ قبضہ کرنا ہے، (سورہ محمد
آیت ۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دشمن کی جنگی طاقت توڑ دی جائے، پھر انکے
آدمیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کیجائے،

(۱۰) جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوں ان کے لیے اختیار دیا گیا ہے کہ ان
پر احسان کیا جائے یا ان سے فدیہ لیا جائے، لیکن ان کو قتل نہ کیا جائے، ایک
بار چند قیدیوں کے قتل کیے جانے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی
تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا (ابو داؤد
جلد ۲ ص ۱۰، سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۰۸)

ایک قیدی سہیل بن عمر بڑا آتش بیان مقرر تھا، آپ کے خلاف
تقریریں کیا کرتا تھا، جب وہ قیدی بنا کر لایا گیا تو آپ سے کہا گیا کہ اسکے
دانت توڑ دیے جائیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے دانت
تڑوا دوں تو اللہ تعالیٰ میرے دانت توڑ دے گا، اگرچہ میں نبی ہوں،
(

یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کو عمدہ کھانا اور دودھ برابر دیا جاتا رہا،

جنگ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں
کے حوالے یہ کہہ کر کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کو کھانے پینے
کی تکلیف نہ ہو، چنانچہ صحابہ خود کھجوریں کھا لیتے لیکن قیدیوں کو پورا کھانا
کھلاتے، حبش کی جنگ کے چھ ہزار قیدیوں کو آپ نے کپڑے کے چھ ہزار
جوڑے دیے،

ذی قرد کی جھڑپ کے موقع پر حضرت سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ کر آیا ہوں، اگر سوا
آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کرکے لاتا ہوں، آپ نے رحمت عام کے
لحاظ سے فرمایا قابو پاجاؤ تو عفو سے کام لینا، (بخاری و مسلم، سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۹۸)

(۱۱) دشمن اگر صلح کے لیے جھکیں تو ان سے صلح کرلی جائے (انفال ۶۱)

(۱۲) معاہدہ کا پیام لے کر کوئی قاصد آئے تو اس کی جان کی پوری
حفاظت کی جائے، اگر اس سے اختلاف بھی ہو تو اس کو کسی حال میں قتل
نہ کیا جائے،

(۱۳) دشمنوں کے لیے جاسوسی کرنا کسی حال میں جائز نہیں، اس جرم
کے ارتکاب میں جسمانی عقوبتیں، طویل قید اور قتل کی بھی سزا تجویز
کی جاسکتی ہے،

(۱۴) دشمنوں سے معاہدہ کی پابندی ہر حال میں کی جائے گی، صلح حدیبیہ
میں یہ طے پایا تھا کہ کافروں یا مسلمانوں میں کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس
کردیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا،
اس صلح کے بعد حضرت ابو جندلؓ قریش سے تنگ آکر مدینہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس چلے آئے اور اپنے جسم کا داغ رو رو کر دکھایا، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ
انکی تکلیف سے متاثر ہوئے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کیلئے رسول اکرمؐ سے بار بار سفارش کی، مگر آپ نے
پابندی عہد کے خیال سے انکو پابہ زنجیر واپس کیا۔ (سیرۃ النبی جلد اول ص ۶۹۰)

(۱۵) اگر دشمن معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو ان کے خلاف جنگی کارروائی
جائز ہے۔

(۱۶) قیدی اور مفتوح علاقہ کے لوگ جزیہ دینا قبول کرلیں تو وہ مسلمانوں
کی طرح آزاد شہری بن کر رہ سکتے ہیں اور ان کو یہ حقوق دیے جائیں: کوئی ان پر
حملہ کرے تو ان کی پوری مدافعت کی جائے ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے،
جزیہ دینے کے لیے ان کو محصل کے پاس جانے کی زحمت نہ دی جائے، ان کی جان،
ان کی عزت، ان کے مال کی حفاظت کی جائے، ان کے قافلے اور تجارت کے کارواں
کو محفوظ رکھا جائے، ان کی زمین ان ہی کے پاس رہے، جو چیزیں ان کے قبضے
میں ہوں بحال رکھی جائیں، ان کے پادری، رہبان اور پجاری ان کے عہدوں
سے برطرف نہ کیے جائیں، صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے، ان
سے عشر نہ لیا جائے، ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے، ان کا مذہب اور
عقیدہ بدلوایا نہ جائے، ان کے حقوق زائل نہ کیے جائیں۔ (فتوح البلدان ص ۵۹-۶۵
مقالات شبلی جلد اول ۱۸۸-۱۸۹)

کیا اس سے بہتر جنگ و صلح کے قوانین آج کل کی اقوام متحدہ کی مجلس پیش
کرسکتی ہے، مستشرقین الزام رکھتے ہیں کہ جزیہ کا ٹیکس لگاکر مسلم اور غیر مسلم شہریوں میں تفریق
پیدا کی گئی، یہ تفریق پیدا کرنے کی خاطر نہیں تھا، بلکہ حفاظتی ٹیکس تھا، اگر غیر مسلم
ممالک اپنے ان مسلمان باشندوں پر جو اقلیت بن کر ان کے یہاں آباد ہیں، ایسے
حفاظتی ٹیکس لگائیں تو وہ شاید اس کے خلاف کوئی ناراضگی کا اظہار نہ کریں،
لیکن موجودہ دور کی فریب کار سیاست میں قول اور فعل کا تضاد ہوتا ہے، روس
انسانی مساوات اور اخوت کا پیام لے کر اٹھا تو اونچی تہذیب و تمدن کو جس کی بنیادیں
سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس میں پختہ کی گئی تھیں مسمار کر کے رکھ دیا، سنگین کی نوکوں سے

خدا کے وجود سے انکار کرایا گیا، گرجاؤں اور مسجدوں میں جانے سے روکا گیا، انجیل مقدس کے اوراق کو سگریٹ کے کاغذ کے لیے استعمال کیا گیا، گرجاؤں اور خانقاہوں کے مال واسباب لوٹے گئے، مذہبی مدارس کھولنے کی اجازت منسوخ کی گئی، کارل مارکس نے یہ نعرہ دیا کہ مذہب انسان کے دل و دماغ پر وہی اثر پیدا کرتا ہے جو افیون کرتی ہے، نکاح اور شادی کے دستور کو ختم کیا گیا، شادی کے رجسٹریشن کو بھی ضروری قرار نہیں دیا گیا، دو عورت مرد زن شو کی طرح جب تک چاہیں زندگی بسر کریں، جب چاہیں علیحدہ ہو جائیں، شراب پینا اور جوا کھیلنا بداخلاقی قرار نہیں دی گئی، شخصی ملکیت کا حق ختم کر دیا گیا، اور جو لوگ اسکے دعویدار ہوں ان کا خاتمہ کردیا جائے، جو شریف کہلاتا تھا انکو رذیلوں سے بدتر بنا دیا گیا، کفر و الحاد کی مستی کو اصلی عقیدہ قرار دیا گیا، ان تمام انقلابات کو لانے کے لیے ہر قسم کے ہنگامے اور سازش کو جائز قرار دیا گیا، خواہ ان ہنگاموں اور سازشوں میں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہیں لینن اہنسا اور سچ کا قائل نہیں تھا، وہ اپنے مقصد کی برآری کیلئے جائز اور ناجائز سب طریقے اختیار کرنا لازمی سمجھتا تھا، اسکے نزدیک اخلاق اور کردار کی اہمیت نہ تھی، اسکا خیال تھا کہ اخلاق اور کردار ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، وہ مذہب کو کفر سے بھی بدتر سمجھتا، اس کے خیال میں یہ اوہام پرستی اور قدامت کی طرف لیجاتا ہے، اس نئی زمین اور نئے آسمان بنانے کے سلسلہ میں جو انقلاب لانے کی کوشش کی گئی، اس کے مخالفوں اور حریفوں کو دار پر چڑھا دینا ایک معمولی سی بات ہو گئی، ابھی کچھ دنوں پہلے روس کے وزیر اعظم خروشچیف نے انکشاف کیا کہ اسٹالن نے اپنے ہزاروں رقیبوں کو قتل کرا کے اس طرح چپکے سے دفن کرا دیا کہ عام لوگوں کو خبر نہ ہوئی، یہ انکشاف روس کی برسر اقتدار حکومت کو پسند نہ آیا، خروشچیف کو معزول کرکے ذلت اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا،

(باقی)

آلِ مقسم قیقانی سندھی

امام ابن عُلیہ بصری اور دیگر علماء و محدثین

از

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

امام اسمٰعیل بن ابراہیم المعروف بہ ابن عُلیہ بصری

ابو بشر اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم بصری، عُلیہ بنت حسان کے بطن سے بصرہ میں پیدا ہوئے، ابن سعد اور خطیب وغیرہ نے ان کی پیدائش ۱۱۰ھ میں بتائی ہے، لیکن ابن ندیم نے ۱۱۱ھ لکھا ہے[1]، جیسا کہ معلوم ہوا وہ اور ان کا خاندان اسد بن خزیمہ کے موالی میں شمار ہوتے ہیں، اس نسبت سے وہ اسدی موالی بنی اسد اور مولیٰ عبد الرحمٰن بن قطبہ اسدی کہلاتے ہیں، لیکن تہذیب الکمال میں اسدی کے بعد قرشی بھی درج ہے[2]، شاید یہ غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی کہ اسد بن خزیمہ کو اسد بن عبد العزیٰ سمجھے اور اس بنا پر ان کو قرشی قرار دیا، مگر ابن حزم نے جمہرۃ انساب العرب میں بنو اسد ابن عبد العزیٰ کا ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے ابن علیہ یا ان کے باپ دادا کے بارے میں اسکی کوئی تصریح نہیں کی ہے، خلاصہ تہذیب الکمال کے علاوہ کسی کتاب میں ابن علیہ کا اسدی قرشی ہونا مذکور نہیں ہے، اسمٰعیل کی والدہ علیہ کے بارہ میں خطیب نے علی بن حجر کا رجحان بتایا ہے کہ

[1] الفہرست ص ۳۱۷، [2] خلاصہ تہذیب الکمال ص ۲۷

وہ ان کی نانی تھیں[1]، مگر تمام تذکرہ نویسوں نے علیہ کو ان کی ماں لکھا ہے، وہ بصرہ کی مشہور صاحبِ علم خاتون تھیں، ان کا مکان علماء و مشائخ کا مرجع تھا، اس لیے اسمٰعیل باپ ابراہیم کے بجائے ان ہی کی طرف منسوب ہو گئے، ابراہیم بن مقسم تجارتی کاروبار میں مصروف رہا کرتے تھے، اس لیے تعلیم و تربیت کا انتظام ماں ہی کو کرنا پڑا، اسمٰعیل ماں کے بجائے باپ کی طرف نسبت پسند کرتے تھے، یہانتک کہ کہتے تھے کہ

من قال ابن علیة فقد اغتابنی	جس نے مجھے ابن علیہ کہا اس نے میری غیبت کی،

مگر یہ نسبت زبانوں پر ایسی چڑھ گئی کہ لوگ ابن ابراہیم کے بجائے ابن علیہ ہی کہتے رہے،

ابن علیہ بصرہ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، لیکن ان کے باپ دادا کوفہ میں مقیم تھے، اس لیے بصرہ کے ساتھ کوفہ کا ذکر بھی ان کے نام کے ساتھ ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ نے انھیں ظاہری حسن و جمال سے بھی نوازا تھا، وہ بصرہ کے خوبصورت ترین لڑکے سمجھے جاتے تھے[2]،

تعلیم و تربیت ابن علیہ کے والد ابراہیم بن مقسم کی دولت و ثروت کا ذکر ہو چکا ہے، کوفہ سے بصرہ تک ان کی تجارت کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ماں کے علم و فضل کا بھی شہرہ تھا، اور بصرہ کے سبھی علماء و مشائخ اور محدثین و فقہاء ان کے فضل و کمال کے معترف تھے، اس لیے انھیں اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں،

امام ابن علیہ نے ۱۱۰ھ میں بصرہ میں آنکھ کھولی، اس زمانہ میں پورا عالم اسلام علمی اور دینی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، اموی خلافت کا عروج تھا، اسلامی فتوحات کا سیل رواں مشرق سے مغرب تک موجیں مار رہا تھا، فقہاء و محدثین علومِ اسلامیہ کی تعلیم اور تدوین

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۱ [2] ایضاً ص ۲۳۱

میں مصروف تھے، بصرہ علم کا بڑا مرکز تھا، اس کے ہر گلی کوچہ میں درس و تدریس کی مجلسیں آراستہ تھیں، اگرچہ اس وقت امام حسن بصری اور امام محمد بن سیرین بصری وغیرہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر ان کے حلقہ نشین اور تربیت یافتہ شیوخ موجود تھے، خود ابن علیہ کا گھر اہل علم و فضل کا مرجع تھا، چونکہ وہ آزاد کردہ باندی تھیں اس لیے کھل کر اہل علم سے ملتی جلتی تھیں اور علمی و دینی مسائل پر گفتگو کرتی تھیں، اپنے بچے کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی نگاہ انتخاب امام عبد الوارث بن سعید بصری متوفی ۱۸۰ھ پر پڑی جو خود بھی قبیلہ بنو تمیم کی شاخ بنو عنبر کے آزاد کردہ غلام تھے، نہایت ثقہ اور حدیث میں حجت کا درجہ رکھتے تھے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ غلام الطرفین بچہ کے پہلے استاد و مربی بھی غلام تھے، علیہ اپنے بیٹے کو ان کی خدمت میں لے گئیں، عبد الوارث کا بیان ہے

اتتنی علیة بابنها فقالت	علیہ اپنے بیٹے کو لیکر میرے پاس آئیں اور
هذا ابنی یکون معك ویا خذ	کہا کہ یہ میرا بیٹا آپ کے ساتھ رہے گا اور
باخلاقك، قال: وکان من	آپ سے آداب و اخلاق کی تعلیم حاصل کریگا،
اجمل غلام بالبصرة، قال:	یہ لڑکا بصرہ کے لڑکوں میں سب سے زیادہ حسین
فکنت اذا مررت بقوم جلوس	و جمیل تھا، جب میں محدثین کی کسی جماعت
قلت له: تقدم فکنت اجیٔ	کے یہاں جاتا تھا تو اس سے کہتا تھا
بعد ه الی المحدث،	کہ پہلے تم آگے بڑھو، اس کے بعد میں حلقۂ درس [illegible]

امام عبد الوارث نے اپنے عزیز شاگرد کی تعلیم و تربیت کی جانب ایسی توجہ کی اور اسلامی اخلاق کی تعلیم و تربیت سے اپنے شاگرد کو اپنے سے اونچا کر دیا، امام ابراہیم حربی کا بیان ہے:

فخرج ابن علیة، واهل البصرة	ابن علیہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو اہل بصرہ

لا یشکون انہ اثبت من — اس میں شک نہیں کرتے تھے کہ وہ
عبد الوارث[1] — اپنے شیخ عبد الوہاب سے زیادہ متقن ہیں۔

اساتذہ ابن علیہ تحصیل علم کے لیے بصرہ سے باہر نہیں گئے، اپنے وطن ہی کے شیوخ و محدثین سے تعلیم حاصل کی، تذکرہ نگاروں نے ان کے اساتذہ و شیوخ میں حسب ذیل اصحاب کا نام لیا ہے:

(۱) ابو عبیدہ عبد الوارث بن سعید بصری مولی بنی عنبر متوفی محرم ۱۸۰ھ بعہد خلیفہ ہارون رشید (۲) ابو التیاح یزید بن حمید ضبعی، ان سے ایک حدیث کا سماع کیا ہے، یہ بصرہ کے نامور فقیہ تھے، ۱۲۸ھ میں انتقال ہوا (۳) عبد العزیز بن صہیب سے بہت زیادہ احادیث کی روایت کی ہے، وہ اور ان کے والدین حضرت انس بن مالک کے غلام تھے، ان کی ثقاہت و بزرگی کا یہ حال تھا کہ قاضی ایاس بن معاویہ نے ان کی تنہا شہادت کو کافی قرار دیا ہے، (۴) ابو عون عبد اللہ بن عون بصری، انھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کی تھی، نہایت ثقہ، کثیر الحدیث اور متقی محدث تھے، رجب ۱۵۱ھ میں وفات پائی (۵) ابو بکر ایوب بن ابی تمیمہ کیسان سختیانی، بصری بنو عنزہ کے آزاد کردہ غلام تھے، حدیث میں ثقہ، ثبت، جامع اور عدل ہونے کے ساتھ نہایت پاکباز متقی اور کثیر العلم تھے، ۶۳ سال کی عمر میں ۱۳۱ھ میں انتقال کیا، (۶) ابو معتمر سلیمان بن طرخان تیمی بصری قبیلہ بنی تیم کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تیمی مشہور ہوئے نہایت ثقہ، کثیر الحدیث اور عبادت و ریاضت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، بصرہ میں ۱۴۳ھ میں فوت ہوئے، (۷) ابو بکر داؤد بن ابی ہند دینار بصری بنو قشیر کی شاخ آل الاعلم کے موالی اور کثیر الحدیث ثقہ محدث تھے، ۱۳۹ھ میں انتقال کیا، (۸) ابو عبیدہ حمید بن ابی حمید طرخان الطویل، کثیر الحدیث ثقہ محدث تھے، ۱۴۲ھ میں

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۲۳۰ و میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۱۰۱

فوت ہوئے، (۹) ابو یسار عبد اللہ بن ابی نجیح یسار مکی مولی اخنس بن شریق، کثیر الحدیث اور صالح الحدیث تھے، ان پر بعض لوگوں نے قدری ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن درست نہیں ہے، ۱۳۱ھ میں فوت ہوئے، (۱۰) ابو یزید سہیل بن ابی صالح ذکوان السمان مدنی حدیث میں ثقہ و ثبت اور اہل مدینہ کے شیوخ حدیث میں حکم کا درجہ رکھتے ہیں، ۱۳۸ھ میں انتقال کیا بعض کتابوں میں سہل بن ابی صالح ہے جو صحیح نہیں ہے، (۱۱) لیث بن ابی سلیم کوفی مشہور فقہا میں سے تھے، اپنے شہر میں مناسک کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے، دارقطنی نے ان کو صاحب سنت کہا ہے، ۱۴۳ھ میں انتقال کیا، (۱۲) ابو مسعود سعید بن ایاس جریری بصری اور اہل بصرہ کے مسلم محدث ہیں، ابن علیہ نے ان سے سب سے زیادہ روایت کی ہے، ۱۴۴ھ میں فوت ہوئے، (۱۳) ابو الحسن علی بن زید بن جدعان بصری قرشی تیمی، پیدائشی نابینا ہونے کے باوجود کثیر الحدیث تھے، محدثین نے ان کو ضعیف بتایا ہے، ۱۲۹ھ یا ۱۳۱ھ میں انتقال کیا، (۱۴) ابو عبد اللہ محمد بن منکدر تیمی مشہور ہیں، علم و فضل کے ساتھ معدن صدق اور صدر نشین صلحا سمجھے جاتے ہیں، ان کے مناقب و فضائل بہت ہیں، چھہتر سال کی عمر میں ۱۳۱ھ میں انتقال فرمایا، (۱۵) ابو السائب عطاء بن سائب ثقفی کوفی نے حضرت انس بن مالکؓ اور اکابر تابعین سے روایت کی ہے، ۱۳۷ھ یا ۱۳۶ھ میں فوت ہوئے، (۱۶) ابو عبیدہ یونس بن عبید بصری، قبیلہ عبد القیس کے آزاد کردہ غلام ہیں، حضرت انسؓ کی زیارت کی ہے، اور حضرات تابعین سے روایت کی ہے، ۱۴۰ھ میں انتقال کیا، (۱۷) ابو عبد الرحمن عاصم بن سلیمان الاحول بصری، بنو تمیم کے غلام ہیں، کثیر الحدیث اور ثقہ عالم ہیں، خلیفہ منصور کے زمانہ میں مدائن کے قاضی رہ چکے ہیں، ۱۴۱ھ یا ۱۴۲ھ میں فوت ہوئے، (۱۸) ابو عروہ معمر بن راشد بصری قبیلہ ازد کے غلام تھے، بصرہ سے یمن چلے گئے تھے، امام عبد الرزاق صنعانی کے

مخصوص تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، ۱۶۵ھ میں انتقال کیا، (۱۹) ابوسہل عوف بن ابی جمیلہ اعرابی بصری قبیلہ طے کے غلام تھے، کثیرالحدیث اور ثقہ عالم تھے، امام حسن البصری کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، ۱۴۶ھ میں فوت ہوئے، (۲۰) یحییٰ بن سعید تیمی کوفی نے امام شعبی وغیرہ سے روایت کی ہے، حدیث میں ثقہ و امام اور صاحب سنت تھے، ۱۴۵ھ میں فوت ہوئے، (۲۱) ابوغیاث روح بن قاسم تمیمی عنبری بصری نہایت مستند حافظ حدیث تھے، احادیث کی تلاش و حفظ میں مشہور تھے، ۱۴۱ھ میں انتقال کیا، (۲۲) ابوریحانہ بصری کا نام عبداللہ بن مطر ہے انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے روایت کی ہے، ان شیوخ و اساتذہ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ حدیث سے ابن علیہ نے روایت کی ہے، ان کے تذکرہ نگاروں نے ان چند ناموں کے بعد "عن خلق" اور "خلق کثیر" لکھا ہے، [۱]

طالب علمی اور جوانی

ابن علیہ اپنی جوانی کے زمانہ ہی میں بصرہ کے عباد و زہاد میں شمار ہونے لگے تھے، [۲]

وہ اپنی ذہانت، حافظہ اور رسوخ فی العلم کی وجہ سے زمانۂ طالب علمی ہی میں مرجع انام بن گئے تھے، حاتم بن وردان کا بیان ہے کہ یحییٰ، اسمٰعیل، وہیب اور عبدالوارث امام ایوب سختیانی کی مجلس درس میں جاتے تھے اور وہاں سے اٹھنے کے بعد یہ سب اسمٰعیل ابن علیہ کے گرد بیٹھ کر ان سے پوچھتے تھے کہ ایوب سختیانی نے فلاں فلاں حدیثیں کیسے بیان

[۱] ان کے نام تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۲۹، تاریخ کبیر ج ۱ ص ۳۴۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۷، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۵، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۵، خلاصہ تذہیب الکمال ص ۲۷ سے اور ان کے مختصر حالات کتاب المعارف ابن قتیبہ، کتاب العبر، تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد وغیرہ سے لیے گئے ہیں [۲] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۸

کی ہیں، اور ابن علیہ سب کے جوابات دیتے تھے، [۱]

دینی علوم میں جامعیت

امام ابن علیہ اسلامی علوم کے جامع تھے، خاص طور سے لغت حدیث، جرح و تعدیل اور فقہ میں ان کا مقام بہت بلند تھا، امام شعبہؒ نے انکو سید المحدثین اور ریحانۃ الفقہا کے لقب سے یاد کیا ہے، ایک مرتبہ اہل بصرہ کے حفاظ حدیث جمع تھے، کوفہ والوں نے ان سے کہا کہ اسمٰعیل بن علیہ کو چھوڑ کر تم لوگ جس کو چاہو ہمارے مقابلہ میں لے آؤ، امام احمد ابن حنبل کا بیان ہے کہ مجھے امام مالک کی مجلس درس نہیں ملی تو اللہ تعالیٰ نے سفیان بن عیینہ کو دیا، اور حماد بن زید کی شاگردی نصیب نہ ہو سکی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں اسمٰعیل بن علیہ کو دیدیا، غندر کا بیان ہے کہ جس وقت میں حدیث کے حصول میں مشغول تھا، کوئی عالم حدیث میں اسمٰعیل بن علیہ سے بڑھ کر نہیں تھا، حماد بن زید کا حال یہ تھا کہ اگر کسی حدیث میں عبدالوارث ثقفی اور وہیب ان کی مخالفت کرتے تو وہ مطلق پروا نہ کرتے اور جب ابن علیہ مخالفت کرتے تو ہیبت زدہ ہو جاتے، یہی حال حماد بن سلمہ کا تھا، چنانچہ عفان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ طلبۂ حدیث حماد بن سلمہ کی خدمت میں موجود تھے، وہ کسی دوسرے کے قول کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس مجلس میں انھوں نے ایک حدیث میں غلطی کی اور کسی نے کہا کہ اس حدیث میں آپ کے خلاف کہا گیا ہے، حماد نے پوچھا کہ کس نے اس کے خلاف کہا ہے، لوگوں نے کہا حماد بن زید، اس پر انھوں نے توجہ نہیں کی، اور جب ایک آدمی مجلس سے بولا کہ ابن علیہ نے اس حدیث میں آپ کے خلاف بات کہی ہے تو یہ سنتے ہی حماد بن سلمہ اٹھکر اندر گئے اور باہر آکر کہا کہ اسمٰعیل بن علیہ نے جو بات

[۱] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۲

کہی ہے وہی درست ہے، قتیبہ بن سعد کا بیان ہے کہ اہل علم کہتے تھے کہ حفاظ حدیث چار ہیں، اسمٰعیل بن علیہ، عبد الوارث، یزید بن زریع اور وہیب،

یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ جس وقت میں بصرہ میں گیا وہاں کوئی محدث ایسا نہیں تھا جو حدیث میں ابن علیہ پر فوقیت رکھتا ہو،

عثمان ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ ابن علیہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ دونوں سے زیادہ اثبت و معتبر ہیں، میں کسی بصری عالم کو ان پر مقدم نہیں کر سکتا، نہ یحییٰ بن معین کو نہ عبد الرحمٰن بن مہدی کو، نہ بشر بن مفضل کو،

ابن سعد نے اسمٰعیل بن علیہ کو حدیث میں ثقہ، ثبت، حجت بتایا ہے، علی بن مدینی کا قول ہے کہ میں کسی کو ابن علیہ سے زیادہ اثبت و معتبر نہیں کہتا ہوں، علی بن مدینی کے علاوہ یحییٰ بن معین، عبد الرحمٰن بن مہدی اور دیگر ائمہ جرح و تعدیل نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی ثقاہت و عدالت کا اعتراف کیا ہے[1]،

خصوصیات و امتیازات امام ابوداؤد کا بیان ہے کہ سعید بن ایاس جریری سے سب سے زیادہ روایت اسمٰعیل بن علیہ نے کی ہے، وہیب کا بیان ہے کہ اسمٰعیل بن علیہ نے عبد اللہ کی کتاب زبانی یاد کر لی تھی، زیاد بن الیوب نے کہا ہے کہ میں نے ابن علیہ کے پاس کبھی کتاب نہیں دیکھی، وہ زبانی احادیث کی روایت کرتے تھے، اور ایک ایک لفظ اور حرف گن گن کر روایت کرتے تھے، عبد اللہ بن سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اسمٰعیل بن علیہ اور بشر بن مفضل کے علاوہ محدثین میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے غلطی نہ کی ہو، علی بن مدینی کا قول ہے کہ سب محدثین نے روایت میں غلطی کی ہے

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۲۳۳-۲۳۴، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۰-۱۰۱، طبقات ابن سبکی ج ۱ ص ۲۳۵ وغیرہ

سوائے چار کے، یزید بن زریع، ابن علیہ، بشر بن مفضل اور عبد الوارث بن سعید، احمد بن سعید دارمی نے کہا ہے کہ حضرت جابرؓ کی حدیث مدبر میں ایک غلطی کے علاوہ ابن علیہ کی کوئی غلطی معلوم نہیں ہوئی، اس حدیث میں انھوں نے مولیٰ کے نام کی جگہ غلام کا اور غلام کی جگہ مولیٰ کا نام لیا ہے، امام احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ زید بن حباب نے مجھ سے کہا کہ ابن علیہ کے علم سے مجھے فائدہ پہنچاؤ، میں ابن علیہ کی احادیث و مرویات کی کچھ کتابیں ان کے پاس لایا، تو انھوں نے ان کتابوں میں سے صرف ابن عون عن محمد، خالد عن ابی قلابہ اور دوسرے علماء کے اقوال و آراء میں سے کچھ رکھ لیا، پھر خود ابن علیہ کے پاس جا کر ان کتابوں کی احادیث کے بارے میں سوال کیا، ابن علیہ اس بات کو بہت پسند کرتے تھے کہ ان سے مسند احادیث اور اسناد کے بارے میں سوال کیا جائے،

امام احمد کے صاحبزادے عبد اللہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ یزید بن ہارون نے ایک حدیث عن حماد بن زید عن الیوب عن مجاہد بیان کر کے کہا کہ علی بن مدینی نے اس کی تخریج کی ہے، میں نے ان سے کہا کہ ابن علیہ نے اس حدیث کو عن الیوب عن مجاہد بیان کر کے کہا ہے کہ اس کی تخریج علی بن مدینی نے کی ہے، انھوں نے سمجھا کہ میں نے ابن علیہ کے بجائے ابن عیینہ کہا ہے، اس لیے کہا کہ ابن عیینہ ہمارے نزدیک الیوب سے روایت کرنے میں حماد بن زید کے مانند نہیں ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں نے تو ابن علیہ کا نام لیا ہے، انھوں نے تعجب سے پوچھا ابن علیہ؟ پھر خاموش ہو گئے[1]

زہد و تقویٰ اور وقار امام ابن علیہ ورع و تقویٰ اور وقار و تمکنت میں بہت آگے تھے،

---

[1] تاریخ بغداد اور میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب وغیرہ۔

ان کے معاصرین نے ان کے ان اوصاف وکمالات کا اعتراف واقرار کیا ہے، اور اس
بارے میں اپنے اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں، ابوعبداللہ احمد بن نعیم نے اپنے بعض دوستوں
سے نقل کیا ہے کہ ابن علیہ بیس سال تک نہیں ہنسے، عمرو بن زرارہ کا بیان ہے کہ میں
چودہ سال تک ابن علیہ کی صحبت میں رہا ہوں، میں نے اس مدت میں ان کو کبھی ہنستے
ہوئے نہیں دیکھا، اور ستائیس سال تک ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، علی بن
مدینی کا بیان ہے کہ میں ابن علیہ کے یہاں رات کو رہا کرتا تھا، صدقات بصرہ کی ولایت
لینے کے بعد میں نے ان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، حماد بن سلمہ کا قول ہے کہ ہم لوگ اسمٰعیل
ابن علیہ کے اخلاق وعادات کو یونس بن عبید کے اخلاق وعادات سے تشبیہ دیتے تھے،
یہاں تک کہ انھوں نے بصرہ کی ولایت قبول کرلی، عفان نے کہا ہے کہ ابن علیہ جس زمانہ میں
جوان تھے، بصرہ کے عباد میں شمار کیے جاتے تھے، ابن معین کا بیان ہے کہ ابن علیہ ثقہ،
مامون، صدوق، مسلم اور پاکباز ومتقی تھے، ابن مدینی کا بیان ہے میں ایک رات ابن علیہ
کے یہاں سویا تو دیکھا کہ انھوں نے نوافل میں تہائی قرآن پڑھا، میں نے کبھی انکو ہنستے ہوئے
نہیں دیکھا، سلیمان بن حرب نے ایک مرتبہ کہا کہ حماد بن زید نے ایوب سختیانی سے سب سے زیادہ
روایت کی ہے، اس پر عبدالوارث نے کہا کہ میں نے ایوب کے انتقال کے بعد انکی مرویات
واحادیث کو اپنی یادداشت سے لکھا ہے، اور ایسی حدیثوں میں جو ہوتا ہے ہوا، اسکے
بعد سلیمان بن حرب نے وہیب بن خالد کی تعریف وتوصیف کی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ
وہ تاجر تھے، دوکان اور بازار نے ان کو علم سے باز رکھا، اور اسمٰعیل بن علیہ کا ذکر کرکے
ان کی ولایت بصرہ پر اعتراض کیا، ایک دن ایک بغدادی آدمی سلیمان بن حرب
کے یہاں جاکر ابن علیہ کا تذکرہ تعظیم وتکریم کے ساتھ کرنے لگا، سلیمان بن حرب نے کہا کہ

بعض لوگ ان پر سکر کا اتہام لگاتے ہیں، بغدادی نے کہا ابوایوب! جب میں ابن علیہ
کے چہرہ کو دیکھتا ہوں تو وقار نظر آتا ہے، اور ان کو پیچھے سے دیکھتا ہوں تو خشوع
وخشیت نظر آتی ہے، سلیمان بن حرب نے یہ سنکر کہا، ایسی بات ہے تو ان کو فلاں فلاں
کی مجلس سے الگ ہوجانا چاہیے، علی بن خشرم نے بھی انکے بارہ میں نبیذ نوشی کا ذکر کیا
ہے، مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے، یہ نشہ آور نبیذ نہیں پیتے تھے، بلکہ کھجور کا ایسا مشروب
پیتے تھے، جس میں سکر (نشہ) نہیں ہوتا تھا[1]

حماد بن سلمہ اور حماد بن زید کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کپڑے کی
تجارت کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اگر پانچ آدمی نہ ہوتے تو میں یہ کام نہ کرتا، پوچھنے
پر بتایا کہ وہ پانچ سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، فضیل بن عیاض، محمد بن سماک
اور ابن علیہ ہیں، ابن مبارک خراسان جاکر کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اور منافع
میں سے بال بچوں اور حج کا نفقہ نکال کر باقی رقم اپنے ان ہی پانچوں بھائیوں کو
دیدیا کرتے تھے،

حسب دستور ایک مرتبہ ابن مبارک بغداد آئے تو ان کو معلوم ہوا کہ ابن علیہ
نے عہدۂ قضا قبول کرلیا ہے، اس لیے نہ ابن علیہ کی ملاقات کو گئے اور نہ ہی ہر سال کی
طرح رقم کی تھیلی بھیجی، جب ابن علیہ کو ان کی آمد کی خبر ملی تو ملاقات کے لیے گئے مگر
ابن مبارک نے بات کرنا تو درکنار ان کی طرف دیکھا بھی نہیں، ابن علیہ اس وقت کچھ
کہے سنے بغیر چلے گئے، دوسرے دن خط لکھ کر اس بے اعتنائی کا سبب دریافت کیا، اسکے
جواب میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسب ذیل اشعار لکھے،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۵ تا ۲۳۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۶، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۱
تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۶ تا ۲۷۸، خلاصہ تذہیب الکمال ص ۷۱، العبر ج ۱ ص ۳۱۰۔

یاجاعل العلم له بازیا یصطاد اموال المساکین

اے علم کو شکاری باز بنا کر مسکینوں کا مال شکار کرنے والے!

احتلت للدنیا ولذاتها بحیلة تذهب بالدین

تم نے دنیا اور اسکی لذتوں کے لیے ایسا بہانہ تلاش کیا ہے جو دین کو ختم کر دیگا۔

وصرت مجنونا بها بعد ما کنت دواءً للمجانین

تم اس وقت دنیا کے دیوانے بن گئے ہو حالانکہ تم دیوانوں کے لیے علاج تھے۔

این روایاتك فیما مضی عن ابن عون وابن سیرین

امراء و سلاطین کے دروازوں سے دور رہنے کی تمھاری وہ احادیث و روایات کہاں گئیں جن کو پہلے ابن عون، ابن سیرین سے بیان کیا کرتے تھے،

این روایاتك فی سردها فی ترك ابواب السلاطین

ان قلت: اکرهت فما کان ذا زلّ حمار العلم فی الطین

اگر تم کہو کہ مجھے مجبور کیا گیا تو اس سے کیا ہوتا ہے، علم کا گدھا کیچڑ میں پھسلکر پھنس گیا،

اللہ اکبر اس وقت سلاطین و امراء سے نفور اور سرکاری عہدوں سے اجتناب کا کیا عالم تھا، آج ہم طلاب دنیا اور حریصانِ منصب و جاہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں، لیکن وہ مردانِ حق حکمرانوں کے سایہ سے بھی گریزاں تھے، انھوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر علم کی آبرو رکھی اور دین کو حکومت کے مصالح پر قربان ہونے سے بچایا،

ابن علیہ زار و قطار رونے لگے اور فوراً مجلس قضا سے اٹھکر خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں پہنچے اور کہا کہ امیر المومنین! خدا کے لیے میرے بڑھاپے پر رحم کیجئے، میں اپنی غلطی کو اب برداشت نہیں کر سکتا، ہارون رشید نے حضرت عبداللہؒ بن مبارک کا نام لیکر

کہا کہ شاید انھوں نے آپ کو بھڑکایا ہے، ابن علیہ نے کہا خدا کے لیے مجھے نجات دیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کو نجات دے، انکے شدید اصرار پر ہارون رشید نے استعفا منظور کر لیا، جب ابن مبارک کو یہ معلوم ہوا تو خوش ہو کر ابن علیہ کے پاس حسب معمول ان کی تھیلی بھیج دی،

ایک روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ قضاء بغداد کے وقت کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق بصرہ کی ولایتِ صدقات سے ہے، حافظ ابن حجر نے اسی کو صحیح بتایا ہے، اور قرینہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، ابن علیہ قیام بصرہ کے زمانہ میں حاجت مند تھے، اس لیے ابن مبارک ان کی مالی امداد کرتے تھے، آخر عمر میں بغداد آئے اور خلافت کی طرف سے ان کا اعزاز ہوا، انھوں نے یہاں ذاتی گھر بنایا، نیز ابن مبارک کے اشعار میں "اموال المساکین" کے الفاظ سے بھی صدقاتِ بصرہ کی ولایت معلوم ہوتی ہے،[1]

بصرہ میں ولایت صدقات اور بغداد میں ولایت مظالم

ابن علیہ کے ماں باپ دونوں غلام تھے، مگر دونوں صاحب جاہ و ثروت تھے والد ابراہیم بن مقسم کوفہ کے کپڑے کے مشہور تاجر تھے، جن کی تجارت بصرہ تک تھی والدہ علیہ بنت حسان بصرہ کے علاقہ عوقہ میں ایک بڑے اور شاندار مکان کی مالک تھیں، جو ان ہی کے نام سے مشہور تھا، اسکے باوجود ابن علیہ نے معمولی زندگی بسر کی، بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بزاز تھے، یعنی کپڑے کی تجارت کرتے تھے، خطیب نے ان کے بارے میں امام ابوداؤد سجستانی کا یہ قول نقل کیا ہے،

هو رجل من اهل الکوفة وہ کوفہ کے بزاز اور بزاسد کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۷، ۲۷۸، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۱ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۸۵

بزاز، ھو مولی بنی اسد[1]
(آزاد کردہ) غلام تھے،

ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ان کا خاندانی پیشہ بزازی ہو، لیکن دوسری روایتوں سے خود ابن علیہ کے تجارت کرنے کا پتہ نہیں چلتا ہے، نیز حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ نے جن پانچ محدثین کے بارے میں فرمایا ہے کہ

"اگر پانچ عالم نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا"[2]

ان میں ابن علیہ بھی تھے، اس بنا پر بھی ان کے بڑے تجارتی کاروبار کا خیال نہیں ہوتا، بعد میں پھر دنیاوی راحت و آرام کے اسباب مہیا ہوئے، اور پہلے بصرہ میں اور بعد کو بغداد میں امارت و ولایت ملی، ابن سعد کا بیان ہے جسے خطیب وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے:

وقد ولی صدقات البصرۃ	ابن علیہ بصرہ کے صدقات (عشر و
وولی ببغداد المظالم	زکوٰۃ وغیرہ) کے امیر ہوئے اور
فی آخر خلافۃ ھارون	ہارون رشید کے آخری دورِ خلافت
ونزل ھو ولدہ ببغداد	میں بغداد میں محکمۂ مظالم کے والی ہوئے اور وہ
واشتری بھا دارا[3]	اور انکے لڑکے بغداد آئے اور وہاں مکان خریدا،

بصرہ کی ولایت کے بارے میں تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی مدت نہایت مختصر رہی اور حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کی سخت تنبیہ کی وجہ سے ابن علیہ نے خلیفہ ہارون کے سامنے استعفاء پیش کر دیا، ہارون رشید محرم ۱۶۹ھ میں خلیفہ ہوا، اور ابن مبارک ۱۸۱ھ میں فوت ہوئے، اس لیے ابن علیہ کی یہ ولایت بصرہ ۱۶۹ھ اور ۱۸۰ھ کے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰ و ۲۳۱ [2] ایضاً ص ۲۳۴ [3] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۲۵ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۰

درمیان رہی ہو گی، اس وقت تک وہ بصرہ ہی میں مقیم تھے، اس کے بعد ہارون رشید کی وفات ۱۹۳ھ سے پہلے یعنی ہارون رشید کے آخری دورِ خلافت میں بغداد کی ولایت مظالم ملی، اسی زمانہ میں وہ اور ان کے بال بچے بصرہ سے منتقل ہو کر بغداد میں مستقل طور سے آباد ہو گئے، اور وہیں ایک شاندار مکان خریدا، اس طرح زندگی کے آخری دن آرام سے گزارے،

فتنۂ خلق قرآن کا الزام

دوسری صدی میں فتنۂ خلق قرآن کی وجہ سے دینی حلقوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، معتزلہ نے خلافت کا سہارا لیکر قرآن کریم کے مخلوق اور حادث ہونے کا عقیدہ پھیلانا چاہا، اس عظیم فتنہ کے مقابلہ کیلئے ائمۂ دین خاص طور سے محدثین سینہ سپر ہو گئے، جن میں امام احمد بن حنبل خاص طور سے قابل ذکر ہیں، درحقیقت انھیں کی ہمت و جانبازی کی بدولت اس فتنہ کا استیصال ہوا، امام احمد ابن علیہ کے شاگرد تھے، لیکن اسکے باوجود لوگوں نے ابن علیہ پر خلقِ قرآن کا الزام لگا دیا، جس کا ذکر آجتک کتابوں میں درج ہے، لیکن بات صرف اتنی تھی کہ ابن علیہ خلیفہ امین کے دربار میں گئے اور اثنائے گفتگو میں یہ حدیث آگئی،

تجیئ البقرۃ و آل عمران یوم	قیامت کے دن سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران
القیامۃ کانھا غمامتان یحاجان	بادل کی شکل میں آئیں گی اور اپنے پڑھنے والے
عن صاحبھما	کی طرف سے بحث کریں گی،

ابن علیہ سے کہا گیا کہ کیا ان دونوں سورتوں کے زبان ہو گی؟ اس پر ابن علیہ کی زبان سے نکل گیا کہ ہاں، ورنہ وہ کیسے گفتگو کریں گی، اسی جملہ کو سنکر ان پر خلق قرآن کا الزام لگا دیا گیا، اور مشہور ہو گیا کہ ابن علیہ خلقِ قرآن کے قائل ہیں،

(باقی)

نفائس الکلام و عرائس الاقلام

راجہ علی خاں فاروقی والی خاندیش (۹۸۴ھ–۱۰۰۵ھ) کے عہد کی ایک فارسی تصنیف

از

ریحانہ خاتون، ام۔ فل ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میران عادل، راجہ علی خاں بن میران مبارک خاندیش کے شاہان فاروقی کے خانوادے کا گیارہواں سلطان گذرا ہے، سیاسی اعتبار سے اس کا دور نہایت ابتلا کا دور تھا، چنانچہ خود اس کے آخری زمانے میں اس کے ملک کے حصے بخرے ہوگئے تھے، فرشتہ کے بقول ۱۰۰۴ ہجری میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے شاہزادہ مراد خان خاناں کی معیت میں احمد نگر پر حملہ آور ہوا، لیکن موسم برسات کی وجہ سے نمایاں کامیابی نہ ہوسکی، راجہ علی خاں فاروقی کی فوجیں مغل افواج کے دوش بدوش احمد نگر کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں، مجبوراً برہان نظام شاہ ثانی والیِ احمد نگر نے مغلوں سے صلح کرلی، طے پایا کہ احمد نگر نظام شاہ کے پاس رہے گا، لیکن برار پر شاہزادہ مراد متصرف ہوگا، راجہ علی خاں کو اسیر اور برہان پور کی طرف روانہ کردیا گیا، اور خان خاناں شاہزادہ مراد کے ساتھ برار میں مقیم رہا۔ اسی درمیان دکنیوں نے شورش کی اور برار پر حملہ آور ہوئے، اس جنگ میں راجہ علی کا کام تمام ہوگیا،

بہرحال سیاسی ابتری کے باوجود راجہ علی خاں کا دور علمی و ادبی ترقی کے لحاظ سے

خاصا قابلِ توجہ ہے لیکن سیاسی تاریخوں سے اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی، البتہ اس دور کی بعض تالیفات اس امر پر بخوبی روشنی ڈالتی ہیں کہ اکبری دور کا مشہور شاعر فیضی فیاضی راجہ علی خاں سے خط و کتابت رکھتا تھا، اس کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہ کو ادب و شعر سے کافی دلچسپی تھی، چنانچہ فیضی نے امیر خسرو کی مثنوی تغلق نامے کی نقل کی اسطرح درخواست کی ہے[1]

سلطنت و ابہت پناہ سید الاقران راجہ علی خاں فاروقی والی خاندیش امید کہ نواب معلی القاب، فرکی اوصاف موید و منصور باشد، بموجب ضرور استدعا نماید کہ از کتاب تغلق نامہ کہ از انفاس متقدسہ امیر خسرو ہست چند ورق از اول و چندے از آخر رفتہ التفات نمودہ دو جزو از ....

اول و ہمیں قدر از آخر بجے از خدمت گاراں امر فرمانید کہ بہر خطے کہ مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند، امید کہ مکارم عالیہ را عذر پذیر ایں جرأت و تصدیع خواہند داشت، ادام اللہ افضالکم

العبد الاقل فیضی،"

راجہ علی خاں کے منتسبین میں ایک فاضل حاجی حرمین عبد اللطیف المنشی نام کا تھا، اُس نے اس بادشاہ کے نام پر اپنی ایک کتاب بنام نفائس الکلام و عرائس الاقلام معنون کی ہے، اس کتاب سے بادشاہ کی سیرت پر کافی روشنی پڑتی ہے،

بقول عبد اللطیف، راجہ علی خاں خود بڑا صاحبِ ذوق اور علماء و فضلاء کا بڑا قدر داں تھا، اس کی وجہ سے اطراف و اکناف کے علماء اُس کے دربار میں جوق در جوق آتے تھے، مؤلف اس طرح رقمطراز ہے[2]:-

---

[1] یہ خط ضمیمہ تغلق نامہ مطبوعہ ۱۹۷۵ء کے مقدمہ ص ۲۲ میں درج ہے[2] ورق ۹۶ ب'

"دربار او مجمع وارد ان گجرات و دکن و محط رجال، ماثل حجاز و یمن شدہ، و

سائر اکناف آں دیار از وجود فائض الجود دانشمندان ہنطوق معزز و

جمیع اطراف آن اقطار از صدر نشینان محفل منثور و منظوم منور و تمیز گردید؛

چنانچہ کاملان ذوی التحقیق از حسن سیرت والی آن ولایت بسکونت آن

معمورہ مبتہج و مسرور و اصلاں مرتبۂ درایت و تدقیق از صفاے سیرت آں حامی

حماے حمایت متمتع بصفات مسرت الخ"

راجہ علی خاں نے اپنی حکومت کے پانچویں سال یعنی ۹۸۹ہ ہجری میں قرآن مجید

حفظ کیا، اور اسی سال تراویح میں پورا قرآن سنایا، عبداللطیف منشی نے اس واقعہ

کا بڑی آب و تاب سے ذکر کیا ہے، اور لفظ "حافظ" سے اس کی تاریخ بھی نکالی ہے[1]،

اس سے بادشاہ کے دینی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے، نفائس الکلام سے مزید یہ معلوم

ہوتا ہے، کہ راجہ علی خاں کو سیرت رسولؐ سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے مطالعہ

میں ملا معین الدین مسکین کی مدارج النبوۃ رہتی تھی، اس کتاب سے بادشاہ کو جس قدر

لگاؤ تھا، اس کا بیان نفائس الکلام کے کئی[2] صفحات میں درج ہے،

نفائس الکلام کا ایک نسخہ بانکی پور کے کتب خانے میں ہے، اس کا تعارف فہرست

کتابخانہ جلد نہم (ص ۱۹۸ - ۱۹۹) میں ہوا ہے؛ اس کتاب کا موضوع خاصہ دلچسپ ہے

اس کتاب کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں،

کتاب کا پورا[3] نام نفائس الکلام و عرائس الاقلام ہے، اگرچہ کتاب باقاعدہ ابواب

میں منقسم نہیں ہے، لیکن ہر مبحث کی ابتدا نفائس الکلام کے فقرے سے ہوتی ہے، اسی

---

[1] ورق ۳۷ الف، [2] ورق ۳۹ ب، [3] ورق ۹۶ ب۔

بنا پر کتاب کا یہی عنوان قرار پایا،

مؤلف نے اپنا نام نزیل البحرین عبداللطیف المنشی[1] لکھا ہے، وہ فاضل شخص تھا، او

عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں دستگاہ رکھتا تھا، اور دونوں میں شعر

بھی کہتا تھا[2]، فارسی میں دو ایک جگہ نطقی[3] تخلص کے ساتھ خود اشعار درج ہیں، ان سے

واضح ہے کہ یہ تخلص مؤلف کا ہے جو اس کے نام کی مناسبت سے اختیار ہوا ہے،

نفائس الکلام کا عام انداز منشیانہ اور مترسلانہ ہے، ممکن ہے اس مناسبت سے کسی

سرکاری عہدے کا حامل بھی رہا ہو، بہرحال پوری کتاب اس کی قادر الکلامی پر

دلالت کرتی ہے،

اس کے طرز کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم کا عنصر نثر کے برابر

ہو گا، اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان منظومات کا بیشتر حصہ خود مؤلف کے قلم کا

رہینِ منت ہے،

مؤلف نے سبب تالیف[4] کے تحت کچھ باتیں لکھی ہیں، لیکن ان سے یہ بات

پوری طرح واضح نہیں ہوتی کہ اس تالیف کی فوری وجہ کیا تھی، صرف اتنا معلوم

ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ وہ بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا،

اس بات کا اندازہ تو ہوتا ہے کہ اس کو تقرب حاصل تھا، مگر کسی عہدے کا حامل تھا

یا نہیں، اس کا صراحۃً علم نہیں ہوتا،

کتاب کی تالیف کا سال وہی ہے جو راجہ علی خاں کی تخت نشینی کی تاریخ ہے جیسا کہ

---

[1] ورق ۹۶ ب، [2] ایک عربی قطعہ کے لئے دیکھئے ورق ۸ الف، [3] دیکھئے ورق ۵۶ الف، ورق ۱۰۰، [4] ورق ۹۶ ب، ۱۰۰ ب۔

آخر کتاب کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے،

نہصد و ہشتاد و چہار از حساب　رفتہ کہ ایں نسخۂ عالی خطاب

یافت رقم از مدد فیض پاک　رونق او تافت بریں لوح خاک

لیکن کتاب میں بعض واقعات ۹۸۴ھ کے بعد کے ہیں، مثلاً ایک مشہور واقعہ ۹۸۹ھ[1] کا تفصیل سے درج ہے، اسی سنہ میں بادشاہ نے قرآن حفظ کیا تھا، اور تراویح میں قرآن سنایا تھا، چنانچہ لفظ "حافظ" سے اس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے، خیال ہوتا ہے اصل مسودہ تو ۹۸۴ھ میں تیار ہو چکا ہوگا، بعد کو اس میں اضافہ ہوتا رہا ہوگا،

اس کتاب کے اتمام پر مولف بادشاہ کی توصیف[2] اس طرح کرتا ہے،

شکر کہ در کوکبۂ عہدِ شاہ　یافت بنا ایں رقم از جہد شاہ

اے کرمت باعثِ فیروزیم　شد ز صد برگ و نوا روزیم

تا نظر سوے من بیدل است　ہر چہ مرا داست مرا حاصل است

بندۂ پروردۂ احسانِ تست　لطفی بیدل کہ ثنا خوانِ تست

آخری شعر میں اپنا تخلص لطفی صراحۃً لاتا ہے،

کتاب کے خاتمہ پر عذر خواہی[3] کرتا ہے:-

وصیت می کنم خلقِ جہاں را　جوانمرداں پیدا و نہاں را

کہ این تالیف را ہر کس کہ خواند　کند بر من دعاے تا تواند

در اصلاح خطاے من بکوشد　وگرنہ دامنِ عفوے بپوشد

مرا خود واجب آمد عذر خواہی　کہ دارد خامہ ام رو در سیاہی

---

[1] ورق ۳۷ الف [2] ورق ۱۰۰ الف [3] ورق ۱۰۰ ب -

پھر لکھتا ہے[1]:-

الٰہی ایں عروسِ حجلۂ غیب　کہ بہر جلوہ سر بر کرد از جیب

حریفِ مجلسِ اقبال بادا　رفیق بخت فرخ فال بادا

قبولش وہ کہ منظور شہ آید　بر اوج شادمانی چوں مہ آید

بداد ے چوں شبِ قدرش کمالے　فزودے چوں مہ بدرش جمالے

جمالش را دمادم تازہ گرداں　کمالش را بلند آوازہ گرداں

اس کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے کافی ہے کہ اس میں اس دور کے جستہ جستہ واقعات ایسے مل جاتے ہیں جو اور ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتے، اس سلسلے کی بعض تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں،

راجہ علی خاں فاروقی کا نام قرشی اور عدوی نسبت سے ملتا ہے[2]:-

"میران عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ الفاروقی القرشی العدوی"

کہ تا چراغ فلک روشن است روشن باد

جہاں زیر تو شمع جمال عادل شاہ

تاریخ جلوس[3] دوشنبہ ۲۰ ربیع الاول سنہ اربع و ثمانین و تسعمایۃ

شاہ فاروقی حسب عادل شہِ والا گہر

چوں تو نبود بر سریر خسروے شاہِ دگر

از جلوس شاہیت تاریخ جستم عقل گفت

نہصد و ہشتاد و چار از ہجرتِ خیر البشر

---

[1] ورق ۱۰۱ ب [2] ورق ۷۶ الف، [3] ورق ۸۳ الف،

راجہ علی خاں اپنے بھائی میران محمد شاہ کی وفات پر تخت نشین ہوا تھا، عبد اللطیف میران محمد کی مدح اس طرح کرتا ہے[۱]:-

جہاں ازیں دو محمد گرفت عزت و جاہ
یکی محمد مرسل کہ ہست ہادی راہ
دگر شہی کہ رواج شریعت او داد
جہان معدلت و مکرمت محمد شاہ

اس کی وفات[۲] کی تاریخ ملاحظہ ہو:-

چو پرسیدند از من سال فوت آن شہ بادل
کشیدم آہ و گفتم حیف از فوت محمد شاہ = ۹۸۴ھ

پناہ افاضل جز او کس نبود   ازاں سال تاریخ ۹۹۰ لطفی بدل
تفحص چو نمودند ز الہام غیبی   چنیں گفت آہ از پناہ افاضل
۹۸۴ھ

میران عادل کے محامد اتنے ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے[۴]؛

گر فتم آنکہ مرا موے تن زباں گردد   بجاے خامہ ز سر تا قدم بناں گردد
محامدش کہ ز ادراک عقل بیروں است   بگفتن و بنوشتن کجا بیاں گردد

اس کے بعد سلطان مذکور کی تعریف میں ایک طویل قطعہ[۵] درج ہے جو بعض لحاظ سے اہم ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے؛

شہی کہ او ز سر صدق ہمچو صدیق است   ز صدق اوست کہ عالم گرفتہ است قرار

۱ ورق ۳۹ ب ۲ ورق ۵۵ الف ۳ ورق ۶۰ الف ۴ ورق ۴۳ ب ۵ قصیدہ فریدی کے تحت درج کیا ہے؛ ورق ۴۴، ۴۵؛

چراغ دولت فاروقیان ازو روشن   ز فر معدلتش ظالماں در استغفار
بعلم و فضل چو عثمان با حیا باشد   بعلم و جود و شجاعت چو حیدر کرار
نہنگ بحر شجاعت سپہر عز و کرم   قضا شکوہ قدر قدرت و فلک مقدار
ملاذ و ملجار شاہان دہر عادل شاہ   رواج یافتہ ز و دین احمد مختار
ز عدل اوست کہ در بر و بحر الفت و انس   گرفتہ اند بہم گرگ و میش و ماہی و مار
بدور عدل تو نوشیرواں اگر بودی   کشیدی از رہ انصاف پاے خود بکنار
خضر خصال سلیماں سریر عیسیٰ دم   خجستہ فالی حمیدہ خصال فتح آثار
تو ئی درخت سرا بوستان دہر کہ ہست   مہ جمال ترا آفتاب آئینہ دار
مدار ملک بود بر سہ عادت ای شہ عصر   بریں سخن ہمہ دارند اہل دل اقرار
سخا و عدل و سیاست ہر آنکہ ہست   ہمیں سہ عادت نیکو ترا ہمیشہ شعار
بمجلس تو کہ رشک ریاض خلد بود   خوش آن کسے کہ چوں رضواں در گرفتہ قرار
من غریب ندانم فلک مرا نچہ ردی   جدا ز درگہ آں شہ نمود و یار و دیار
فلک ہمیشہ بمن در مقام بیرحمی است   زمانہ در پے کیں دہر بر سر آزار
مگر عنایت و الطاف شاہ فاروقی   شود معین و کفیل غریب بی مقدار
کہ بر مراد و تمناے خود ظفر یابد   شود خلاص ز جور سپہر کج رفتار
یگانہ کہ ز روز نخست تا امروز   جہان و خلق جہان را بدوست استظہار
چراغ کشور ہندوستاں کہ ذاتش ہست   چو شمع باصرہ در دیدۂ اولی الابصار
ازوست گرمی ہنگامۂ مجالس انس   ازوست نور بچشم سپہر کینہ گذار
زہے بناے علو ترا قضا بانی   زہے اساس جلال ترا قدر معمار

بنور رائے تو محتاج شد ممالک ہند بلے چراغ بود ناگزیر در شبِ تار

کنند اہل ورع در صوامع طاعات پس از محامد ذات مہیمن غفار

ثنائے مدحت تو بالغدو والآصال دعائے دولت تو بالعشی والابکار

ہمیشہ تا بود از سیر دیر چرخ نجوم زمانہ را بدلائل علامت و آثار

بمقتضائے رضائے تو باد سیر نجوم بوفق رائے تو گردادہ گنبد دوّار

لیکن قابل توجہ امر یہ ہے کہ عبداللطیف المنتی نے بادشاہ کا نام راجہ علی خان فاروقی کے بجائے کبھی میران شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ فاروقی لکھا ہے، اور کبھی میران عادل شاہ بن مبارک شاہ بن عادل شاہ، لیکن باوجود اس کے تاریخوں میں مذکور راجہ علی خان وہی ہے جس کو عبداللطیف نے میران عادل شاہ یا صرف میران شاہ لکھا ہے، تاریخوں میں بھی اس خاندان کے اکثر بادشاہوں کو میران اور عادل شاہ یا عادل خان کے نام سے[1] یاد کیا گیا ہے،

راجہ علی خان فاروقی کے جلوس کی محفل ۲۰ ربیع الاول ۹۸۴ھ میں برہان پور میں قائم ہوئی، اس موقع پر عبداللطیف نے بائیس[2] علماء و فضلاء کا ذکر کیا ہے، جو اس محفل میں خصوصیت سے شامل تھے، چونکہ ان علماء کے ذکر سے تاریخیں خالی ہیں، اس لئے ان کا تذکرہ دلچسپی[3] سے خالی نہ ہوگا،

۱- سید محمد بخاری :- وہ اپنے زمانہ کے عارفوں میں تھے، اور بخارا کے رہنے والے تھے، "حضرت عرفان شعار ہدایت آثار ..... المنظور بنظرات الباری السید محمد البخاری"[3]،

[1] دیکھیے فرشتہ ج ۲، ذیل شاہان فاروقیہ خاندیش، [2] یہ بیان نفائس الکلام کے ورق ۶۵ تا ۸۱ پھیلا ہوا ہے، [3] ورق ۷۸ - الف

شیخ ہفت اقلیم قطبِ اولیار واصل کامل ندیم کبریا

ہادی ملت امامِ شرع و دین جانِ پاکش منبعِ صدق و یقین

چو محمد نام و عیسیٰ دم شدہ سرّ حق را محرم و ہمدم شدہ

فیض عامش شاملِ حال ہمہ ہمتش میسور آمالِ ہمہ

مفخر اہلِ بخارا آمدہ معدنِ علم و ہدا آمدہ

از وجود او بنزد دوستاں جنۃ الماوی شدہ ہندوستاں

۲- عرفان پناہی افادت دستگاہی مولا روح اللہ لاری، موصوف کی مدح میں نفائس الکلام میں ۶ بیت پر مشتمل ایک عربی قطعہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے[1]:-

بحر العلوم و من یحسن بیانہ تنظیم اشکال العویص یسہل

۳- قدوۃ الاولیاء و مرشد الاصفیاء خدام خواجہ حسین، خواجۂ مذکور حضرت معین الدین چشتی اجمیری کی اولاد میں تھے، عبداللطیف ان کا ذکر عقیدت سے کرتے ہیں[2]:-

آنکہ مبرا بود از جملہ شین واصل حق حضرت خواجہ حسین

قابلِ آئینۂ دیدارِ حق حاملِ گنجینۂ اسرارِ حق

نقد مقالات و معانی ہمہ عقد کمالاتِ نہانی ہمہ

عرض خلائق سوی خالق رساں بخشش خالق بہ خلایق رساں

۴- قدوۃ الواصلین و مرشد السالکین خدام شیخ ابراہیم بروجی بغدادی موصوف

[1] ورق ۸۰ ب، [2] ورق ۷۹ الف

کی مدح میں صاحبِ نفائس الکلام اس طرح رقم طراز ہیں[1]:-

از آں قسمت کہ بخششہا نمودند دو ابراہیم را رتبت فزودند

یکے دولت سرائے ملت آراست یکے شد کار خلق از ہمتش راست

از آں گشت آتش سوزندہ ریحاں ازیں نار ستم شد نورِ احسان

ازاں شد خانۂ درگہ پُر نور ازیں دلہائے اہل اللہ معمور

شکست آں یک بت آزر بجستی وزیں یک دینِ احمد را درستی

۵- سید مصطفےٰ دہلوی کی مدح میں نفائس میں یہ ابیات درج ہیں[2]:-

شیخ جہاں نقد وفا و صفا نجم ہدیٰ رشد و دین مصطفےٰ

مہبط الہام دل پاک اوست شمع خرد پرتو ادراکِ اوست

کاملِ دین واصل عالی سند کاشفِ اسرار ازل تا ابد

اے چونبی کردہ بفقر افتخار آمدہ در راہِ فنا استوار

۶- سید محمد قادری بھی عرفان کے رمز شناس تھے، اُن کے مدحیہ اشعار اس طرح کے ہیں[3]:-

اے شدہ از جملہ نقائص بری واصل مجذوب بحق قادری

ساجد محراب جمال الٰہ رہبر او گشت خط لا الٰہ

کثرتِ او گشت بوحدت بدل جوہر حال آمد وحلی شد محل

نکتہ سر بستہ جہاں در جہاں سلسلہ در سلسلہ راز نہاں

۷- حضرت ہدایت شعار و حقائق آثار........ قدوۃ السالکین و عمدۃ الواصلین،

[1] ورق ۲۹ ب، [2] ورق ۷۰ ا - [3] ورق ۷۰ ب،

برہان المحققین شیخ برہان ابن شیخ محمد غوث گوالیاری اپنے والد ماجد کی طرح بڑے درجے کے عارف تھے، عبداللطیف اُن کی مدح میں یوں رطب اللسان ہیں[1]:

اعنی آں عارف معارف دوست کہ سند اہلِ معرفت را اوست

مالک مملکت ولایت خاص مرشد و مقتدائے ذوالاخلاص

مورد واردِ خفی و جلی عارفِ سِرِ حضرتِ ازلی

آں جواد از مذاہبِ غیبی مورد واردات لاریبی

بر سرِ معرفت بود گنجور کشف اسرار ازو گرفت ظہور

بحرِ فضل و معدنِ ایقاں بحرِ توحید و منبع عرفاں

والا ماجدش بما ذا نام غوث اسلام بود و شیخ کرام

در گوالیر چوں بیاسودہ عالمی رُخ بخاک آں سودہ

۸- سید ابراہیم بھکری کی تعریف عبداللطیف المنشی نے حسب ذیل اشعار میں کی ہے[2]

آنکہ بود رہبرِ ہر صادقے راہ نمایندۂ ہر عاشقے

ملتمس گوشہ نشینان راز ہم نفس خلوتیان نیاز

بدرقہ کعبہ روان کمال راہبر قافلۂ اہلِ حال

شیخ ابراہیم کہ از لطفِ حق در ورع او بردہ ز جملہ سبق

فخر اہالی بھکر آمدہ مرشد ہر بہر و دو بہر آمدہ

خادم او گشتہ ز صدق و نیاز شیخ نظام آنکہ بود گنج راز

۹- خدام سید بھول کا ذکر ان اشعار میں ہوا ہے[3]:

[1] ورق ۷۱ ب [2] ورق ۷۲، [3] ورق ۷۳،

آنکہ بود پیر راہ رسول عارف و آگاہ زمان شیخ پھول

کاشف انوار معانی حق واقف اسرار نہانی حق

چشم خدا بیں بصفا باز کرد دیدہ بدیدار خدا باز کرد

منظر او آئینہ نور شد آ سان ناظر و منظور شد

۱۰۔ شیخ عبدالکریم بھی اسی دور کے ایک بزرگ تھے، وہ جود و کرم میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، عبداللطیف منشی ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں[51]:۔

آں بلند آوازہ در برہان پور دیو جہل و معصیت از وے نفور

عارف حق صاحب طبع سلیم صاحب بذل و کرم عبدالکریم

پیشوائے طالباں مقبول حق نہ فلک بر خوان جودش یک طبق

۱۱۔ قدوۃ الواصلین شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن بھی اسی عہد کے ایک صاحب حال بزرگ ہوئے ہیں، نفائس الکلام میں یہ اشعار ان کے لئے پائے جاتے ہیں[52]:۔

زیبائے صلاحش چہرہ پر نور بہ اخلاق گرامی سینہ معمور

نیارد بر زباں جز راستی ہیچ نباشد در کلام او خم و پیچ

بود عبدالحکیمش نام و شہرت زد جد و حال باشد در مسرت

۱۲۔ حقائق آثار و عرفان شعار خدام شیخ ابو جیو خضر[53] بھی راجہ علی خان فاروقی کی تخت نشینی کے موقع پر موجود تھے، وہ ایک صاحب نسبت بزرگ معلوم ہوتے ہیں، عبداللطیف منشی رقمطراز ہیں[54]:۔

[51] ورق ۳، ب، [52] ورق ۴، [53] یہ نام ایک بار ابوجی خضر کی شکل میں ملتا ہے؛ [54] ورق ۴، و

پور خضر خضر رہ سالکان واصل حق مرشد اہل زباں

ای گہر مخزن گنج خدائے پرتو مہرت بجدا رہ نمائے

مطلع انوار تجلی توئی آئینہ صورت و معنی توئی

قبلہ ذرات جہاں روی تست روے ہمہ کعبہ رواں سوے تست

۱۳۔ حضرت ہدایت رتبت خدام شیخ لشکر اپنے دور کے مرشد تھے، ان کے لئے یہ اشعار منقول ہیں[55]:۔

مرشد کامل کہ نامش لشکر است لشکر اہل صفا را رہبر است

شہسوار عرصہ میدان راز ہم بدعوی ہم بمعنی سرفراز

اختر تابان برج اولیاء گوہر رخشان درج اصفیاء

مقتدائے جملہ اہل وفا پیشوائے زمرہ صدق و صفا

۱۴۔ شیخ برہان نعمان کا بھی شمار بڑے مشائخ میں ہوتا تھا، ان کی مدح میں یہ اشعار لکھے گئے ہیں[56]۔

اے در صافی کہ زرہ شرف آمدہ برتر ین نہ صدف

در حق حجت و برہان توئی نیست شکی وارث نعمان توئی

سر نہانی بتو لائح شدہ کشف معانی بتو واضح شدہ

کعبہ اصحاب صفائے کوی تست قبلہ ارباب وفا روے تست

۱۵۔ حضرت سیادت رتبت و شرافت مرتبت سید راجن بخاری کی توصیف ان اشعار میں بھی ہوئی ہے[57]۔

[55] ورق ۴، ۵۰، [56] ورق ۵، [57] ورق ۶، و

میوۂ بستانِ مصطفوی غنچۂ گلستانِ مرتضوی

شرف و فخر خاندانِ رسل معنی نکتۂ فروع و اصول

آں سراپا بہائے منبع نور رہبرِ خلق در جمیع امور

ماہی لجۂ فنا فی اللہ ماہر نقطۂ بقا باللہ

گشتہ قایل ہمیشہ از ہر ذوق در کمال سرور و بہجت و شوق

لیس فی الکائنات الا ہو نکتہ بشنو ز راجنِ شاہو[1]

۱۶- صدر المدرسین مفید الطالبین شیخ یوسف بنگالی کے لئے یہ اشعار ملتے ہیں[2]،

پیشوائے جملۂ اہل کمال شیخ یوسف قدوۂ ارباب حال

علم او دریائے بی ساحل بود لطفِ او مفتاحِ ہر مشکل بود

فیض مطلق گشتہ او را عین ذات مستفیض از فیض عامش کائنات

حادی علم و کمالات آمدہ ماحی ظلم و جہالات آمدہ

(۱۷) مولانا عثمان مدرس مختلف علوم میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، عبد اللطیف لکھتے ہیں[3]:

حضرت عثمان کہ ز فضل الٰہ فایق دہر آمدہ بی اشتباہ

پیش رو راہروان رشاد عارف مبدا بود و ہم معاد

مجمع اسرار الٰہی بود مظہر انوار کماہی بود

ہست بلند اختر و خورشید رای ہندسہ دانست و مجسطی گشای

سوی مطالب شدہ او را عقول اوست مخاطب بہ فروع و اصول

عالم اسرار سماوات و ارض عارف اشیا شدہ در طول و عرض

---

[1] ممکن ہے راجشاہو میں اضافت ابی (د)، [2] ورق ۷۷ ب، [3] ورق ۱۷۷

(۱۸) حضرت شریعت پناہی غوث ممالک قاضی کبیر محمد، پیشوای قضاۃ اسلام، مقتدائے ولاۃ انام، ناصر ملت غرا مروج شریعت سمحا[1]:

آنکہ در روز ازل بنوشتہ منشی قضا

از برای حضرتش منشور حکم جاوداں

گشتہ احکام شریفش با عدالت ہمنفس

باد ذات بی عدیلش با فضیلت توأماں

کی تعریف میں عبد اللطیف منشی نے دو عربی بیت درج کئے ہیں۔

(۱۹) حضرت قاضی عبد الغنی کی مدح میں یہ اشعار ملتے ہیں[2]:

قضاۃ شرع پرور زیب ملکند بفر قاب وقایع ہمچو ملکند

اصول دین از ایشاں استوار است سریر ملک از ایشاں پایدار است

آنکہ بود مشرب و عیشش ہنی فاضل دہر آمدہ عبد الغنی

ای چو گل از پردہ راز آمدہ پردگی گلشن راز آمدہ

حامل انوار حقایق تو ئی شامل اسرار دقایق تو ئی

چرخ فلک کوکبہ آرای تست دیدۂ انجم بہ تماشای تست

آمدہ خیل علما از صفا وارثِ علم ہمہ انبیا

ہست ولی عالم روشن جبیں ماصدق صفحۂ علم الیقیں

باطن این طائفہ معمور باد ظاہر ایشاں ز ریاد و رباد

---

[1] ورق ۷۸ ا، [2] ورق ۷۸ ب

(۲۰) حضرت شریعت پناہ فضیلت دستگاہ محیط مرکز علم و کمال، مرکز محیط فضل و افضال .... قاضی روح اللہ دکھنی:

دانندۂ علوم شریعت کہ حضرتش بی اشتباہ مرجع ارباب ملت است[1]

قاضی موصوف کی مدح میں عربی کا ۱۰ بیتی قطعہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

قاضی القضاۃ امام الناس قاطبۃ ـــ محی الشریعۃ عون الدین والملل

(۲۱) علامۃ الزمان مولانا محمد وجیہ الدین کا ذکر عبد اللطیف المنشی نے ان اشعار میں کیا ہے[2]:-

آں شدہ مرآت ظہور و بطون ـــ نیست درون از تو درون و برون

پیش خرام صف مردان عشق ـــ بدرقہ راہ نوردان عشق

کعبۂ دیں قبلۂ اہل قبول ـــ آنکہ ز حق یافتہ قرب وصول

(۲۲) جناب خدام شیخ احمد محتسب آخری فاضل ہیں جن کا ذکر نفائس الکلام میں اس طرح ملتا ہے[3]:

ای چو خورشید در زمانہ وحید ـــ چشم دانش ترا نظیر ندید

ہستی از محرمان بزم حضور ـــ از وصالش نگشتہ مہجور

یکسر موحد انہٗ زاحد ـــ در محامد از ان شدی احمد

ان ہم عصر واقعات کے علاوہ نفائس الکلام میں بعض ایسے امور کا ذکر ہے، جو اسلامی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتے ہیں، ان میں سے چند امور یہ ہیں:

۱۔ لفظ وزیر کی تحقیق، اور وزارت کا بیان (۲):

---

[1] ورق ۹۶، [2] ورق ۱۰۰، [3] ورق ۱۰۱ الف۔

۲۔ خلافت کی توضیح و تشریح،

۳۔ امامت، خلافت اور حکومت،

۴۔ خلافت خلفاء راشدین

۵۔ خلفاء بنی امیہ

۶۔ ائمۂ دوازدگان

۷۔ صفات امام و خلیفہ، احادیث و اقوال کی روشنی میں[1]

۸۔ حکایات اخلاق عربی و فارسی

۹۔ چہل حدیث در بارہ عدل

نفائس الکلام کا واحد نسخہ بانکی پور کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ اسکی تاریخ کتابت ۱۰۹۹ھ ہے۔ کاتب شیخ محمد بن عبد اللہ صدیقی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ نسخہ خود مولف کے عہد سے تعلق رکھتا ہے، یہ ضخیم کتاب بڑے سائز کے ۳۸۰ اوراق پر مشتمل ہے۔

---

[1] یہ ایک طویل باب ہے جو ورق ۱۶۸ تا ۳۶۲ پھیلا ہوا ہے۔

شعور نبوت اور شعور اجتہاد کی ضرورت

از مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سیمنار میں پڑھا گیا جو اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ۲۲ تا ۲۵ جنوری ۷۷ء منعقد کیا گیا تھا جس کا موضوع "اسلام تغیر پذیر دنیا میں تھا" (معارف)

تغیر پذیر دنیا میں اسلام کے لیے دو قسم کے شعور کی ضرورت ہے،

(۱) شعور نبوت اور

(۲) شعور اجتہاد

شعور نبوت سے مراد علم و حکمت کا نور، اور فہم و ادراک کا وہ کمال ہے جو نبوت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور اس کے لیے لازم ہے اس کو یہ قوت بھی حاصل ہوتی ہے کہ برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر کسب فیض کرے اور ماورائی حقیقت سے حاصل کردہ علم و ادراک کو وحی الٰہی کی شکل میں پیش کرے یہ شعور علم و ادراک کا نہایت اونچا محفوظ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ذریعہ سمجھا جاتا ہے،

شعور اجتہاد سے مراد وہ ملکہ یا ہیئت راسخہ ہے کہ جس کے ذریعہ شعور نبوت کے علم و ادراک سے اخذ و استنباط پر قدرت حاصل ہو، اس شعور کی تکوین شعور عقل اور شعور قلب دونوں کے "آمیزہ" سے ہوتی، اور اس میں عقلی بصارت اور قلبی بصیرت، دونوں کی نمود ہوتی ہے،

ختم نبوت پر شعور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن یہ اس وقت ختم ہوا جب کہ شعور اجتہاد اس کی قائم مقامی کے قابل بن گیا یعنی اس میں اس درجہ پختگی توانائی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختم نبوت سے قبل رسول اور نبی کے ذریعہ آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود غور و فکر اور تلاش و جستجو سے یہ مسائل حل کرنے لگا،

لیکن زندگی و معاشرہ کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شعور عقل و شعور قلب کے فیصلے و نتائج طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے خالص و بے آمیز نہیں ہوتے ہیں، بلکہ رسمی حجابات اور وضعی حالات ان دونوں میں اسقدر پیوست ہوتے ہیں کہ کلی طور پر انکو کسی وقت جدا نہیں کیا جاسکتا، ایسی حالت میں لازمی طور پر شعور اجتہاد (جس کی تکوین میں دونوں کی آمیزش ہے) کے فیصلے و نتائج نہ بالکلیہ خالص و بے آمیز ہونگے اور نہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے اس کو آزاد و خود مختار چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ بلکہ ہر موڑ اور ہر موقف پر اس کے لیے بلند و برتر رہنما کی تلاش و ضرورت ہوگی کہ جس کی رہنمائی میں حتی المقدور اپنے فیصلے و نتائج میں نکھار پیدا کر سکے اور جس کا دامن عصمت اس کی تر دامنی کے لیے ذریعہ نجات بن سکے۔

یہ رہنما شعور نبوت ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص و بے آمیز ہونے کی ضمانت نہیں ملتی۔

اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ علم و ادراک کی دونوں قسمیں موجود و محفوظ ہیں،

(۱) وہ علم و ادراک جو برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر شعور نبوت نے حاصل کیا ہے،

جس کا تعلق خارجی وماورائی حقیقت سے ہے، اس کا اصطلاحی نام "قرآن" ہے۔

(۲) وہ علم وادراک جو نبوت کے تخلیقی وجدان ودا خلی شعور کا نتیجہ اور قرآن کی معنوی دلالت سے اخذ واستنباط کیا ہوا ہے، اس کا اصطلاحی نام "حدیث" ہے،

ان ہی دونوں کی رہنمائی میں شعورِ اجتہاد شعورِ نبوت کی قائم مقامی کا شرف حاصل کرتا اور اپنی چاک دامنی کے لیے رفوگری کا سامان مہیا کر کے فائز المرام ہوتا ہے،

شعور کی اس وضاحت کے بعد اب اسلام اور تغیر پذیر دنیا میں غور کرنا چاہیے، غالباً یہ بات ہم سب کو تسلیم ہے کہ اسلام کی حیثیت انکشافِ حقیقت کی ہے، جو بذاتِ خود ایک آئیڈیل ہے، سماجی عمل کی نہیں ہے کہ جس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا بلکہ سماج ہی اس کے دروبست کا مالک ہوتا ہے، جو چیز انکشافِ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتی اور اسی کی روشنی میں تغیر پذیر دنیا کا مطالعہ ہوتا رہتا ہے، اور جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اس وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس کی جگہ کوئی اور عمل یا طریقہ اختیار کر لیا گیا تو پھر وہ چیز تاریخی بن جاتی ہے،

اسلام کی یہ حیثیت متعین ہونے کے بعد تغیر پذیر دنیا میں اسلام کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا سوال نہیں اٹھتا، بلکہ اصل سوال اس کی تعلیمات اور تغیر پذیر دنیا کی تنظیمات میں ربط وتعلق کا رہتا ہے، یہ دنیا آج نہیں بلکہ ابتداء ہی سے تغیر پذیر ہے، اسلام بھی نیا نہیں، بلکہ شروع ہی سے اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، اس بنا پر ربط وتعلق کا مسئلہ بھی کوئی انوکھا اور نیا نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام شعورِ نبوت کے ذریعہ یہ ربط وتعلق پیدا کرتے رہے اور ختمِ نبوت کے بعد اجتہاد کے ذریعہ اس کو بحال رکھنے کی کوشش ہوتی رہی ہے،

تغیر پذیر دنیا آسمان سے نہیں اترتی بلکہ انسان کے ہاتھوں وجود میں آتی ہے جس میں

خیر وشر دونوں کا وجود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے، اس سے گھبرانے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو انسان اس کو وجود میں لاتا ہے، وہی انسان اسلام کی نسبت سے خیر وشر کی حد بندی کر کے اور عدل واعتدال کی قوت پیدا کر کے اس کی قدر وقیمت کا تعین بھی کر سکتا ہے، انبیاء علیہم السلام نے یہی حد بندی اور قوت پیدا کر کے اپنے وقت کی تغیر پذیر دنیا کو بطور نمونہ پیش کیا تھا، اور ختمِ نبوت کے بعد اسی حد بندی اور قوت کو بحال رکھ کر اسلام کو زندۂ جاوید ثابت کیا گیا تھا۔

ختمِ نبوت کے بعد جب ایرانی، رومی، حبشی، قبطی، ترکستانی اور سندھی قوموں سے سابقہ پڑا جن کے حالات ومعاملات مختلف تھے، معاشی وسیاسی نظام میں تفاوت تھا، کہیں پر ایرانی تہذیب وقانون کو دخل تھا، تو کہیں رومی تمدن وقانون کا اثر تھا، غرض عجمیوں کے اختلاط سے ایک عجیب کشمکش پیدا ہو گئی، اور ان کے ساتھ معاملات سے نئی نئی ضرورتیں ابھر آئیں اور بہت سے نئے نئے مسائل حل طلب قرار پائے، جن کی وجہ سے عرب کی سادگی کو دھکا پہونچا اور اسلام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی دیکر اس کے دامن کو وسیع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت بھی یہی "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کا سوال اٹھا تھا، لیکن رہنمایانِ ملت کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ چین نصیب کرے کہ انھوں نے جس انداز سے اس سوال کو حل کر کے اسلام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے اور نئے احوال وظروف کو جس ہمت کے ساتھ اسلام کے وسیع دامن میں سمیٹا وہ ہماری تاریخ کا نہایت روشن باب ہے، اگر خدانخواستہ ان پر جمود طاری ہوتا یا اسلام کو آزادی دینے والی طاقت کے بجائے اس کو معطل کرنے والی آہنی زنجیر سمجھتے تو اسلام صرف عرب میں محدود ہو کر رہ جاتا، اور ہمیشہ کے لیے اس کی عالم گیریت ختم ہو جاتی، پھر آج وہ اس

قابل نہ رہتا کہ "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" سوالیہ نشان بن کر اس پر سیمینار کیا جائے،

یہ صحیح ہے کہ آج کی تغیر پذیر دنیا محض حالات کے اتار چڑھاؤ اور قوموں کی آمد و رفت سے نہیں رونما ہوئی، بلکہ ایک دور کے بعد دوسرے دور کے آنے سے ظہور پذیر ہوئی ہے، اس سے بھی انکار نہیں کہ بات صرف حاجت و ضرورت پر نہیں ختم ہوتی بلکہ منفعت کے حصول، مضرت کے دفعیہ کا سوال ہے اور زندہ رہنے کے لیے موجودہ سر و سامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے،

لیکن یہ حقیقت بھی تو مسلم ہے کہ خیر و شر میں امتیاز اور خوبیوں اور خامیوں میں حد فاصل قائم کرنے کے لیے وہ پیمانہ موجود ہے جو شعور نبوت نے پیش کیا ہے، وہ نمونہ موجود ہے، جو ختم نبوت نے پیش کیا ہے، اور وہ طریق کار موجود ہے، جس کے ذریعہ شعور اجتہاد نے اسلام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی کا رنگ دیا ہے،

اب اس شعور اجتہاد کے ذریعہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ تغیر پذیر دنیا میں کس چیز کو لینا اور کس چیز کو چھوڑ دینا ہے، کس میں کاٹ چھانٹ کرنا اور کس سے نظر بچا کر نکل جانا ہے، کس کو بعینہ قبول کرنا اور کس کو بالکلیہ نظر انداز کر دینا ہے، کس میں نئی روح پھونکنا اور کس کے لیے نیا قالب تیار کرنا ہے، عبوری مرحلہ کس طرح گزارنا اور ہنگامی حالات کا کیسے مقابلہ کرنا ہے، اور سب سے بڑی بات فطرت کی کاٹ چھانٹ کو سمجھنا اور اس سے عبرت و بصیرت حاصل کرنا ہے، کہ فطرت خود ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شے کو فٹ کرتی رہتی ہے، جب کوئی شے ایک جگہ فٹ ہو گئی تو وہ کمتر شے کیلئے جگہ نہ چھوڑیگی، بلکہ قبضہ کے لیے اس سے بلند و برتر شے کا ہونا ضروری ہے،

اس "دیکھنے" میں شعور نبوت کی "حکمت عملی" کو اپنانا ہوگا جس نے اپنے وقت کی تغیر پذیر دنیا میں "ازالہ" کے بجائے "امالہ" کی روش اختیار کی اور خذ ما صفا و دع

ما کدر" کے اصول پر عمل کر کے چیزوں کو قبول کیا،

اس "دیکھنے" میں بنیادی نقطہ نگاہ یہ بنانا ہوگا کہ اگر اس وقت محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف فرما ہوتے تو منفعت کے حصول اور مضرت کے دفعیہ کا کس قدر لحاظ فرماتے اور تدریج و تخفیف کے کن اصولوں پر عمل کر کے لوگوں کی دلجوئی کرتے۔

اس "دیکھنے" میں ہر نظر و صلاحیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ اس کی نظر و صلاحیت درکار ہوگی جو اس فن کا ہو اور جس کا اصطلاحی نام "فقیہ" ہے،

الفقیہ العالم الذی یشق الاحکام و یفتش عن حقائقها	فقیہ وہ عالم ہے جو احکام کا تجزیہ کرتا ان کے حقائق کی تفتیش کرتا، اور
ما استغلق منها (جار اللہ زمخشری کتاب الفائق جزء ثانی - فقہ)	ان کے مشکل امور کو واضح کرتا ہے،

فقیہ کے لیے معاملہ فہمی و دنیوی مصلحت شناسی بھی ضروری ہے

فقیهاً فی مصالح الخلق فی الدنیا۔ (الغزالی احیاء العلوم ج الفظ الاول الفقہ)	دنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں کا رمز شناس ہو۔

غیر فقیہ سے اس رسائی اور فنی الہام کی توقع نہیں ہے، جو اسلام اور تغیر پذیر دنیا میں ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے درکار ہے،

فقیہ کے لیے اللہ سے گہرا تعلق بھی ضروری ہے کہ اس راہ کے مسافروں نے ہمیشہ اسی سے قوت و مدد حاصل کی ہے، یہ تعلق صرف ضابطہ کا نہیں بلکہ رابطہ کا ہونا چاہئے جس کے لیے مقررہ احکام کی بجا آوری کے ساتھ آہ سحر گاہی کا التزام بھی نہایت سود مند ہے،

دیکھنے میں اس اہتمام و احتیاط کے باوجود قدم قدم پر شدید مخالفت ہوگی، اگر ایک طبقہ تردامنی کا الزام لگائے گا، تو دوسرا چاک گریبانی کا طعنہ دیگا، کسی کو جدید سے گھبراہٹ ہوگی تو کوئی قدیم سے برافروختہ ہوگا، اپنوں کی ناراضی اور بیگانوں کی شماتت کا مقابلہ آسان نہیں ہے، لیکن اس راہ کے مسافروں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے گھبرانا اور پریشان نہ ہونا چاہیئے، بس اللہ کا نام لے کر اور اسی کی تائید و نصرت کے بھروسہ پر کام شروع کر دینا چاہیئے، اور پامردی کے ساتھ اسے جاری رکھنا چاہیئے، اور اگر کوئی، اس کے لیے تیار نہیں ہے تو اس سے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ :۔

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اسی شعور اجتہاد (جس کی تکوین عقل و قلب کے آمیزہ سے ہوتی ہے،) کے ذریعہ موجودہ تغیر پذیر دنیا میں ان بنیادوں کی نئی تعبیر و تشریح کرنا ہے، جن پر اسلامی تعلیمات کا مدار ہے اور ان نظریات کا جواب تلاش کرنا ہے جنھوں نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلادی ہیں، اور انسان کی نئی توجیہ پیش کر کے اصول دین تک کو مشکوک بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے فتنۂ ارتداد ہمارے گھروں میں گھس چکا ہے، اور ہم بے بس تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں، اس صورت حال کو بدلنے کے لیے بڑے سلیقہ اور دانشمندی کی ضرورت ہے، اب ہمیں چاہیئے کہ

(۱) انسان کی نفسیاتی توجیہ اس انداز سے کریں کہ اس کی نورانی اصل نمایاں ہوجائے اور (۲) تحت الشعور کے ان مخفی تاروں کی نشاندہی کریں جن کا براہ راست تعلق ایک ذی شعور طاقت سے ہے، اور جنکو چھیڑے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا، اور بہت سے نغمے خاموش رہتے ہیں، ہمیں یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ (۳) تحت الشعور میں ایک ذی شعور طاقت سے محبت کی کارفرمائی ہے جو حیات اور روح حیات کا سرچشمہ ہے،

اسی کے ساتھ (۴) اخلاق و اقدار کی حقیقی و دائمی حیثیت کا جدید انداز میں ثبوت فراہم کرنا، بزرد (۵) اس ذریعۂ علم کا جدید انداز میں ثبوت فراہم کرنا ہوگا جس کی رسائی ماورائے محسوسات تک ہے، اور یہ سمجھانا ہوگا کہ (۶) خیر و شر اور طیب و خبیث (۷) کی شناخت کے لیے ایسے پیمانہ کی ضرورت ہے، جو انسانی جذبات و خواہشات کی گرفت سے آزاد ہو،

مندرجۂ بالا خیالات کے اثبات کے ساتھ ان نظریات کی تردید بھی ضروری ہے جو ان کے خلاف ہیں مثلاً

(۱) انسان کی ایسی میکانکی توجیہ جو اس کی نفسی ساخت میں خود شعوری کے وصف اور ایک ذی شعور طاقت کی کارفرمائی سے انکار کرے، اور نورانی کے بجائے اس کی اصل مادی و حیوانی قرار دے، (۲) تحت الشعور میں جنسی خواہش یا جذبۂ اقتدار کو اصل الاصول تسلیم کرے، (۳) اخلاق و اقدار کو اضافی قرار دے کر اسلام کو ایک سماجی عمل ثابت کرے، (۴) ذرائع علم کو صرف محسوسات تک محدود رکھے اور ماورائے محسوسات سے انکار کر دے، (۵) اخلاق و اقدار، خیر و شر، طیب و خبیث کے لیے وہ معیار و پیمانہ تسلیم کرے، جو انسانی جذبات و خواہشات کا ساختہ و پرداختہ ہے، ان افکار و نظریات کی تردید میں بھی بڑی دانائی اور ہوشمندی سے کام لینا ہوگا۔

اس نئی تعبیر و تشریح اور تردید و تنقید کے لیے فقیہ کی نظر و صلاحیت درکار ہے، لیکن یہ اصطلاحی فقیہ نہیں بلکہ قرآنی فقیہ ہے، جو "حکیم" کے ہم معنی ہے، اور جس کی مناسبت سے فقہ بھی صدر اول میں علم حقیقت (وہ علم جس میں الہیات اللہ کی ذات و صفات سے بحث ہو) علم طریقت (جس میں نجات دلانے والے اور ہلاکت میں

ڈالنے والے اعمال و افعال سے بحث ہو) اور علم شریعت (جس میں ظاہری احکام و مسائل سے بحث ہو) تینوں کو شامل تھا۔

اس فقیہ کے لیے حکمت فرنگی کے ساتھ اس حکمتِ ایمانی سے واقفیت بھی ضروری ہے، جو اسلامی اصول سے والہانہ عقیدت اور اللہ و رسول سے شدید محبت کے سرچشمہ سے پھوٹتی ہے، جس کی طرف اشارہ مولانا رومی نے کیا ہے۔

چند خوانی حکمتِ یونانیاں (افرنگیاں) — حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں

تلخیص و تبصرہ

طوفانِ نوح آثار قدیمہ کی روشنی میں

از

منصور نعمانی ندوی رفیق دار المصنفین

کویت کے موقر رسالہ مجلۃ العربی کے جنوری کے شمارہ میں آثار قدیمہ کی روشنی میں طوفان نوح کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے، ذیل کی سطور میں اسکا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں برٹش میوزیم کے مسٹر جارج اسمتھ کی نگرانی میں نینوا کے قدیم شہر میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے طوفان نوح کے بارے میں بعض نہایت حیرت انگیز انکشافات منظر عام پر آئے ہیں، اس کھدائی سے برآمد ہونے والے آثار قدیمہ میں چکنی مٹی کی بکثرت ٹوٹی پھوٹی تختیاں ملیں، اور ان کی کندہ عبارتوں کو حل کرنے سے طوفان نوح کے بارے میں اہم حقائق معلوم ہوئے، ان تختیوں میں سب سے اہم وہ تھیں جن پر اس طوفان کا واقعہ کندہ ہے۔

یہ تمام تختیاں ساتویں صدی قبل مسیح میں ملک آشور کے فرمانروا اسر نیپال کے کتب خانہ کا بیش قیمت سرمایہ خیال کی جاتی تھیں، جارج اسمتھ کو اس کھدائی میں نینوا کے قدیم محل کے کھنڈروں سے اس کتب خانہ کی تقریباً دو ہزار تختیاں دستیاب ہوئیں ان ہی میں گلگامش کی وہ گرانقدر تختیاں بھی شامل تھیں، جنکے مطالعہ سے شاہ اسرنیپال

کے عہد سے ہزاروں سال قبل کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے، اس نظم کا سب سے پہلا ترجمہ اغریقی زبان میں ملتا ہے، جسے تقریباً ۲۷۵ء قبل مسیح میں بروسس نامی ایک کاہن نے مٹی کی تختیوں پر کیا ہے، لیکن دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے میں نظم گلگامش کے ایک اس سے بھی قدیم ترین نسخہ کا سراغ ملتا ہے جس کی تاریخ انیسویں صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ حامورابی کے عہد سے ملتی ہے،

نظم گلگامش کے نسخہ حامورابی اور نسخہ اسرنیبال کے انکشاف سے اس حقیقت میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ طوفان نوح ان دونوں بادشاہوں کے عہد سے بہت پہلے واقع ہوا تھا، ان تختیوں پر طوفان نوح کے بارے میں شاہ گلگامش کی جو مشہور نظم کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تاریخ انسانی کے اس بدترین سانحہ سے دوچار ہوئے ان میں شورو پاک کا بادشاہ اوتانا پشتیم بھی شامل تھا، صرف یہی بادشاہ اور اس کا خاندان اس ہمہ گیر سیلاب سے محفوظ رہا، باقی سارا ملک تباہ ہوگیا، گلگامش نے اپنی نظم میں اسی اوتانا پشتیم کی زبانی واقعۂ طوفان کی تفصیلات بیان کی ہیں، اوتانا پشتیم کہتا ہے کہ "میں شوری پاک نام کے ایک شہر میں رہتا تھا، اور آیا دیوتا کے مخلص ترین معتقدوں میں شمار ہوتا تھا، جب دیوتاؤں نے نوع انسانی کی جڑیں کاٹنے کا عزم کرلیا تو معبود ایا نے اپنے بندۂ خاص اوتانا پشتیم کو خطرہ سے خبردار کرتے ہوئے اس طرح خطاب کیا،" اے شوری پاک کے آدمی! اپنے گھروں کو چھوڑ دے اور کشتی بنا، مال و متاع سے کنارہ کشی اختیار کر، اپنی املاک پھینک دے، زندگی تلاش کر، دنیا کی تمام زندہ اشیاء کے تخم کشتی میں جمع کر۔" چنانچہ کشتی بنائی گئی، یہ ایک عجیب وغریب مربع کشتی تھی، جس کے طول، عرض اور بلندی سب میں نہایت حسن تناسب پایا جاتا تھا، اس کے بنانے میں لکڑی اور کولتار کا استعمال بہت بڑی مقدار میں کیا گیا تھا، اسکے

تختوں کو کولتار سے مضبوطی سے جوڑا گیا تھا، اور یہ وسیع و عریض کشتی سات منزلوں کی تھی اور ہر منزل میں سات کمرے تھے اور ہر کمرہ میں ایک دروازہ اور متعدد روشندان تھے،

اوتانا پشتیم اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے گلگامش سے کہتا ہے کہ جب روز روشن پر شب تار نے اپنی دبیز چادریں ڈال دیں تو ہر طرف خوف وہراس کی لہر دوڑ گئی، میں ماحول کی تبدریج بدلتی ہوئی ہولناکی کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا، یہاں تک کہ طوفان کی تباہ کاریوں کا آغاز ہوگیا، دن بھر خوفناک آندھیاں پہاڑوں اور میدانوں میں زور وشور سے چلتی رہیں، طوفان سے لوگوں کا رشتۂ حیات اس طرح منقطع ہوگیا جیسے وہاں کوئی معرکۂ کارزار گرم ہوا ہو، کوئی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پاتا تھا، چھ شب و روز تیز و تند ہوائیں چلنے اور اہل زمین کے برباد ہونے کا سلسلہ جاری رہا، ساتویں دن کی صبح کو سمندر میں سکون ہوا، ہوائیں رک گئیں، طوفان کم ہوگیا اور پانی گھٹ گیا، میں نے اپنی آنکھیں دریا پر دوڑائیں، سب انسان مٹی میں مل گئے تھے، کھیت نظر آتے تھے نہ جنگل، جس وقت میں نے کشتی کا دروازہ کھولا تو روشنی میرے چہرے پر پڑی، میں جھک پڑا اور گھٹنوں کے بل بیٹھکر آہ وبکا کرنے لگا، آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے، بالآخر کشتی جبل نصر کی چوٹی پر ٹھہر گئی ساتویں دن میں نے ایک کبوتر لیا اور اس کو اڑا دیا، وہ دور تک اڑکر واپس آگیا، کیونکہ اس کو بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں مل سکی، پھر میں نے ایک ابابیل لی اور اس کو چھوڑ دیا، وہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ نہ پاکر کشتی میں لوٹ آئی، پھر میں نے ایک کوے کو اڑا دیا، پانی اس وقت کم ہو چکا تھا، چنانچہ کوا بازو پھڑپھڑاتا اور شور مچاتا اڑ گیا اور واپس نہیں آیا، اس کے بعد میں نے کشتی کے لوگوں کو ہر چہار سمت بھیجا اور کفارہ کے طور پر چڑھاوا چڑھایا۔"

توراۃ میں طوفان کا ذکر نینوا کے کھنڈروں سے برآمد ہونے والی تختیوں کے علاوہ توراۃ میں بھی طوفان کا ذکر ملتا ہے، اس میں صراحت سے مذکور ہے کہ حضرت نوحؑ نے خداوند قدوس کی تعمیل حکم میں ایک کشتی بنائی جس کا طول ۳۰۰ گز، عرض ۵۰ گز اور بلندی ۳۰ گز تھی، تقریباً چالیس شب و روز آندھیاں چلتی رہیں، درخت جڑوں سے اکھڑتے رہے اور سیلاب کی تباہ کاریاں جاری رہیں، یہانتک کہ نوحؑ نے کشتی کی کھڑکی کھولدی اور کشتی جبل نصر پر رک گئی،

قرآن اور طوفان نوح تاریخ کے اس عظیم ترین اور حیرت انگیز واقعہ پر قرآن نے اپنی مخصوص شان بلاغت اور حسین پیرایۂ بیان میں بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، چنانچہ سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے :-

واوحی الی نوح انه لن یؤمن
من قومك الا من قد آمن
فلا تبتئس بما کانوا یفعلون
واصنع الفلك باعیننا ووحینا
ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا
انهم مغرقون ویصنع الفلك
وکلما مر علیه ملأ من قومه
سخروا منه قال ان تسخروا منا
فانا نسخر منکم کما تسخرون
فسوف تعلمون من یاتیه

اور نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تمھاری قوم میں جو لوگ ایمان لا چکے ان کے سوا اور کوئی ایمان نہ لائیگا، تو جو کام یہ کر رہے ہیں انکی وجہ سے غم نہ کھاؤ، اور ایک کشتی ہمارے حکم سے ہمارے روبرو بناؤ، اور جو لوگ ظالم ہیں ان کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا وہ ضرور غرق کر دیے جائیں گے، تو نوحؑ نے کشتی بنانا شروع کر دی، اور جب انکی قوم کے سردار انکے پاس سے گزرتے تو ان سے تمسخر کرتے، وہ کہتے کہ اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو اسی طرح

عذاب یخزیه ویحل علیه
عذاب مقیم حتی اذا جاء
امرنا وفار التنور قلنا
احمل فیها من کل زوجین
اثنین واهلك الا من سبق
علیه القول ومن آمن
وما آمن معه الا قلیل
وقال ارکبوا فیها بسم الله
مجریها ومرسها ان ربی
لغفور رحیم وهی تجری بهم
فی موج کالجبال ونادی
نوح ابنه وکان فی معزل
یا بنی ارکب معنا ولا تکن
مع الکفرین، قال ساوی
الی جبل یعصمنی من الماء
قال لا عاصم الیوم من امر
الله الا من رحم وحال بینهما
الموج فکان من المغرقین
وقیل یارض ابلعی ماءك

(ایک وقت) ہم بھی تم سے تمسخر کریں گے، اور تمکو جلد معلوم ہو جائیگا کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا، اور کس پر ہمیشہ کا عذاب نازل ہوتا ہے، یہانتک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور جوش مارنے لگا، تو ہم نے (نوح کو) حکم دیا کہ ہر قسم (کے جانداروں) میں سے ایک ایک جوڑا (نر و مادہ) لے لو اور جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے (کہ ہلاک ہو جائیگا) اسکو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو لوگ ایمان لائے ہوں انکو کشتی میں سوار کر لو اور انکے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے (نوح نے) کہا کہ خدا کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا، اس میں سوار ہو جاؤ، میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے، اور وہ انکو لیکر پہاڑوں جیسی لہروں میں چلنے لگی، اس وقت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو کہ (کشتی سے) الگ تھا پکارا کہ بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ، اور کافروں میں شامل نہ ہو، اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جا لگونگا، وہ مجھے پانی سے بچا لیگا، انھوں

وقیل یسماء اقلعی وغیض الماء	نے کہا کہ آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں
وقضی الامر واستوت علی	مگر جس پر خدا رحم کرے، اتنے میں دونوں کے
الجودی وقیل بعدا	درمیان لہر آحائل ہوئی اور وہ ڈوبکے رہ گیا
للقوم الظلمین	اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے
	آسمان تھم جا، تو پانی خشک ہوگیا اور کام تمام
	کر دیا گیا اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری،
(سورہ ہود)	اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں پر لعنت،

ایک خیال قرآن اور دوسری کتب مقدسہ میں طوفان کی جو تفصیلات مذکور ہیں، اسکے سلسلہ میں ولیم وسٹن وغیرہ بعض یورپی محققین کی رائے ہے کہ یہ روئے زمین پر ۲۳۶۵ یا ۲۳۴۹ قبل مسیح میں ایک حادثۂ آسمانی کے طور پر واقع ہوا تھا، انکے نظریہ کے مطابق اس وقت ایک دم دار ستارہ کرۂ ارضی کے قریب سے گزر گیا تھا، جس کی کشش ثقل کے باعث کرۂ ارض بیضۂ مرغ کی شکل اختیار کر گیا، اور پھر سطح زمین پھٹ گئی اور اسکے اندر سے پانی پھوٹ پڑا جو کرۂ ارض کے اوپر بہنے والے پانی سے مل کر ایک خوفناک طوفان بن گیا،

ایک سوال اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سطور بالا میں ہزاروں سال قبل کے جس طوفان کے واقعات مذکور ہوئے ہیں وہ کسی مخصوص اور معین طوفان سے متعلق ہیں یا انکا تعلق ان بکثرت سیلابوں سے ہے، جو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں وقتاً فوقتاً آتے رہے ہیں،

اس سلسلہ میں محققین کی رائے یہ ہے کہ گو مختلف مصادر میں یہ حادثہ مختلف طریقوں سے مذکور ہے، لیکن چونکہ تمام روایات یکساں ہیں اس لیے اون کا ایک ہی طوفان سے متعلق ہونا قرین قیاس ہے اور وہ بلاشبہ طوفان نوح ہی ہے خواہ جزوی طور پر نام اور طرز بیان مختلف کیوں نہ ہوں.

مطبوعات جدیدہ

مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔

مرتبہ ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت اچھی، کتابت خراب، صفحات ۴۰۴، مجلد مع گرد پوش قیمت عنہ ۲۰ ناشر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

علمائے ہند میں مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کا درجہ بہت بلند ہے، ان پر اردو و عربی میں بعض کتابیں پہلے لکھی جا چکی ہیں، یہ نئی کتاب دراصل وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو مسلم یونیورسٹی نے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دی ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں شاہ صاحب کے وطن، خاندان، پیدائش، تعلیم و تدریس، اخلاق و عادات، قومی و سیاسی خیالات، فارسی و عربی کلام کے نمونے، وفات، اولاد و اعزہ اور زندہ تلامذہ کی فہرست دی گئی ہے، دوسرے حصہ میں پہلے بالترتیب حدیث، تفسیر اور فقہ میں شاہ صاحب کے امتیازات دکھائے گئے ہیں اور آخر میں تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، مصنف نے حدیث، تفسیر اور فقہ کے بعض مسائل و مباحث کے متعلق شاہ صاحب کی خاص تحقیقات اور نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے قدیم ائمۂ فن کے اقوال بھی تحریر کیے ہیں، مصنف نے مقدور بھر کتاب محنت سے لکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن شاہ صاحب جیسی عظیم المرتبت اور صاحب علم و کمال ہستی کی سوانح عمری بڑی وسعت نظر اور گہری عالمانہ بصیرت کی طالب تھی، یہ کام مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے کرنے کا تھا، نوجوان مصنف کی بساط سے باہر ہے، تصنیف کے میدان میں ابھی انھوں نے قدم رکھا ہے،

اس لیے ترتیب میں ناہمواری اور سلیقہ کی کمی پائی جاتی ہے بعض مواقع پر تعبیر و طرز ادا کی خامی کی وجہ سے مطلب خبط ہوگیا ہے، عبارت میں الجھاؤ اور جملے بے ربط ہیں، زبان و بیان کی خرابی کے علاوہ جا بجا علمی و تاریخی غلطیاں بھی نمایاں ہیں، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے "امام شافعی ترمذی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں" (ص ۲۱۴) حالانکہ امام شافعی کا زمانہ امام ترمذی سے بہت پہلے ہے، ایک جگہ شاہ صاحب کی کتاب "العرف الشذی" کے حوالہ سے لکھتے ہیں "امام طحاوی صرف مذہب حنفی کے ہی عالم نہیں بلکہ مذاہب اربعہ کے بھی امام ہیں، انھیں امام شافعی، امام مالک اور امام اعظم سے براہ راست تلمذ کا شرف حاصل ہے"، حالانکہ امام ابوحنیفہ و امام مالک تو درکنار امام شافعی کا زمانہ بھی امام طحاوی کو نہیں ملا تھا، وہ ان کے شاگرد مزنی کے شاگرد تھے، طحاوی ائمۂ احناف میں ضرور شمار ہوتے ہیں لیکن ان کا مذاہب اربعہ کا امام ہونا بڑی مضحکہ خیز بات ہے، شاہ صاحب ایسی بات ہرگز نہیں لکھ سکتے، مصنف نے یقیناً ان کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی ہے، کہیں کہیں مصنف کے بیان میں تضاد بھی ہوگیا ہے، مثلاً ص ۱۹۹ پر لکھتے ہیں "صحابہ کرام کی بڑی تعداد عدم رفع یدین کی روایت کرتی ہے" مگر ص ۲۰۰ پر لکھتے ہیں "عبداللہ بن مسعودؓ عدم رفع یدین کے قائل ہیں ورنہ صحابہ کرام کی ایک بہت بڑی تعداد رفع یدین کی قائل ہے"، آگے پھر یہی لکھا ہے، کتاب میں جا بجا حشو و زوائد اور تکرار بھی ہے اور زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں ہیں، عربی و فارسی عبارتوں کے ترجمے نہیں دیے گئے ہیں، حوالے کے نمبر غلط اور بے ترتیب ہوگئے ہیں کہیں کہیں حوالہ موجود ہے، مگر نمبر نہیں، اور کہیں نمبر ہے تو حوالہ ندارد، معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کے مشیر و نگراں اور ممتحن زیادہ توجہ نہیں کر سکے، ورنہ ایسی خامیاں نہ ہوتیں اور شاہ صاحب کی ایک اچھی سوانح عمری تیار ہو جاتی۔

روداد چمن ۔ مرتبہ مولانا محمد الحسنی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۹۲ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۱۵ روپے، پتہ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ۔

ندوۃ العلماء کی ابتدا ایک علمی، دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی حیثیت سے ہوئی تھی، اسی کے ماتحت لکھنؤ میں ایک دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا تھا، شروع میں اس عظیم الشان تحریک کے پیام و مقاصد کے تعارف و اشاعت کے لیے اس کے سالانہ جلسے بڑے اہتمام سے ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتے رہے، اور ان میں قدیم علماء، جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور ہر طبقۂ فکر و خیال کے مشاہیر و اعیان شریک ہوتے رہے، لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دور نظامت میں جب ندوہ کی تحریک میں نئی زندگی پیدا ہوئی تو ان اجتماعات کا بھی خیال آیا، چنانچہ ۱۳۱ اکتوبر سے ۳ نومبر ۷۵ء تک شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی صدارت میں ندوہ کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن دارالعلوم کی عمارت میں بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا، اس میں اسلامی و عربی ملکوں کے بکثرت مندوبین کے علاوہ ہندوستان کے ہر طبقہ و مسلک کے علماء و زعماء، ماہرین تعلیم، قدیم و جدید ملی و دینی درسگاہوں کے فضلا اور ذمہ دار حضرات بڑی تعداد میں شریک تھے اور اس میں ندوہ کے اصلاحی و تعلیمی نظریات کے علاوہ موجودہ بہت سے اہم مسائل پر تقریریں ہوئیں اور مضامین پڑھے گئے، زیر نظر کتاب میں ندوہ کے اسی پچاسی سالہ جشن کی مفصل روداد بڑے دلچسپ اور پُراثر انداز میں قلمبند کی گئی ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ حالات اس طرح بیان کیے جائیں کہ نہ دیکھنے والوں کے سامنے بھی ان کی تصویر آجائے، مرتب نے اس اجلاس کے اہم خطبوں، مقالات اور تجویزوں کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے، اس طرح مولانا ابوالحسن علی کا پُراثر خطبۂ استقبالیہ، فاضلانہ مضمون "اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت" ان کی دوسری پُراثر تقریریں، شیخ الازہر کا خطبۂ صدارت، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی تاریخی رپورٹ اور جشن کے سلسلہ میں موصول ہونے والے اہم پیغامات اور خطوط تمام چیزیں سلیقے سے جمع کر دی گئی ہیں، اس لیے اس کی حیثیت ایک یادگار

دستاویز کی ہوگئی ہے، اس سے جشن کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور جو لوگ اجلاس میں شریک تھے، اور جو نہیں شریک تھے، دونوں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں،

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت:-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" " "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	صباح الدین عبدالرحمن، عبدالسلام قدوائی ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں،

سید اقبال احمد

جلد ۱۲۰ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۷ء عدد ۴

مضامین